ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ہماری نئی مطبوعات

مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شہرۂ آفاق تفسیر تفہیم القرآن

کا اسپیشل سیٹ اور ترجمہ قرآن مجید کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے

اس کے علاوہ ادارہ ترجمان القرآن کی نئی کتابیں

- ○ مولانا مودودی کے سیاسی افکار — از عبدالکریم عابد
- ○ دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ — از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
- ○ سفینۂ نجات — از جمیل احسن ندوی
- ○ تحریک اسلامی کے ماخذ — از سید اسعد گیلانی

طبع ہو کر جلد آنے والی ہیں

پہلی بار تفہیم القرآن آفسٹ کاغذ پر شائع کیا جا رہا ہے

خوبصورت لیدر بائنڈنگ اور خوشنما چھپائی۔

اس کے لیے اپنا آرڈر بک کرائیں:

ادارہ ترجمان القرآن 5-A ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

اعراض ۱۶۶ موچند بلڈنگ، انارکلی، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۷ | اپریل ۱۹۸۲ء مطابق جمادی الاخری ۱۴۰۲ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶ ———

زرسالانہ تیس روپے ۔ فی پرچہ ۳/۔ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایک سچا داعیِ حق اپنا فرض ادا کر ہی نہیں سکتا، اگر اس کی زندگی رزقِ حلال پر نہ گذر رہی ہو۔ وہ اگر دنیوی لذات اور نعمتوں کی کثیر اور معیارِ زندگی کی مسابقتِ عام میں شریک ہو جاتا ہے تو اول تو اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا کہ وہ عوام میں دعوت پھیلانے کا کام کر سکے، اور اگر وقت بچتا ہے تو اس کا تھکا ماندہ درماندہ دماغ اور جسم اپنی قوتیں پوری طرح نچوڑ چکا ہوتا ہے۔ وہ اگر تحریک کی خدمت کرنے کے لیے اُٹھتا بھی ہے تو پوری صلاحیت سے کام نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں حرام آمدنی کو اپنی معاش میں شامل کر لینے کے بعد اس کا ضمیر مجروح ہو جاتا ہے اور اخلاقی کمزوری اس پر چھا جاتی ہے۔ مجروح ضمیر اور کمزور اخلاق کے ساتھ دعوتِ حق کے میدانِ کشمکش میں جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ بے دلی یا نیم دلی سے، جاہد انداز سے اور اُکھڑے اُکھڑے لہجے کے ساتھ کونسا کارنامہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ میں اپنے یارانِ طریق سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ نہ صرف اپنی ذات کی حد تک رزقِ حلال کی پابندی کریں بلکہ اُس کو اپنی دعوت کا ایک نکتہ بنا لیں اور اُس کے لیے پوری سرگرمی سے کام لیں۔

اسی احساس کے ساتھ میں یہاں اپنا ایک صدارتی خطاب پیش کر رہا ہوں جو شام ہمدرد (مورخہ یکم اپریل ۱۹۸۰ء) کی تقریب منعقدہ لاہور میں پڑھا گیا (ن۔ ص)

آج ہم ایک ایسے غیر صحت مند ماحول میں گھرے ہیں کہ ہمارے ضمیر زخم زخم ہیں، اور ایک مسلسل اضطراب

ہمارے عروق و اعصاب پر چھایا ہوا ہے۔ ہر کوئی اپنی روحانی تونس میں مبتلا ہو کر مادیت کے سرابوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اور جتنا بھاگتا ہے، تونس بڑھتی جاتی ہے۔ اور کوئی سراب ایسا نہیں جو ایک گھونٹ پانی فراہم کر سکے۔

اس مادہ پرستانہ دورِ زندگی نے آدمی کی ساری توجہ جسمانی زندگی پر مرتکز کرا دی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جسم کی آسائشوں کے لیے رنگارنگ سامانوں کے انبار لگا دیے ہیں، انسان ہوائے نفس کے آسیب کا شکار ہو گیا ہے۔ انسانی دل و دماغ کی ساری دلچسپیاں خواہشوں کے رنگین کھلونوں اور رغبتوں کے گرد جمع ہو گئی ہیں۔ دولت خادمِ انسان ہونے کے بجائے صنم خانۂ تمدن کا مہا دیوتا بن گئی ہے۔ معیارِ زندگی کی پرستش شروع ہو گئی ہے۔ لوگ ناجائز کمائیوں کے گندے پانی کے سیلِ تند میں بہ رہے ہیں اور بہتے ہوئے غوطے بھی کھا رہے ہیں۔ رزقِ حرام کے طوفان میں جیسے ہر شخص جہازِ عمرِ رواں پر بے اختیار بیٹھا ہو۔ جس کا کوئی بادبان ہے نہ ساحل!

تشویشناک حقیقت یہ ہے کہ دولت پرستی اور جذبۂ خدمت، یا رزقِ حرام اور حسنِ اخلاق آپس میں شدید تضاد رکھتے ہیں اور آپس میں ملتے نہیں بلکہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ جس شخص نے جان بوجھ کر حرام کی روزی کمائی۔ اُس نے حُسنِ اخلاق کے دروازے اپنے اُوپر بند کر لیے۔ اور جس کے ہاں حُسنِ اخلاق نہیں ہے اُس کی روزی کبھی پاکیزہ نہیں رہ سکتی۔ رزقِ حرام کے ساتھ بعض افراد میں جو اخلاق پایا جاتا ہے وہ محض ایک خول ہوتا ہے۔

اللہ نے اپنے تمام انبیاء کو، اور انبیاء کی معرفت ان کی پیرو اُمتوں کو یہ اُصولی ہدایت دی کہ یٰٓاَیُّھَا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا (المومنون ۲۳-۵۱)۔ یعنی اے میرے رسولو! پاکیزہ روزیاں کھاؤ اور عملِ صالح پر کاربند رہو۔ چھ سات الفاظ کا یہ مختصر ارشاد ایسا ہے کہ اُصولی طور پر قریب قریب پورے دین کا منشا اس میں آ گیا ہے۔ اگر کوئی شخص رزقِ حلال و طیب کی پابندی کے ساتھ عملِ صالح میں زندگی گزارتا ہے تو گویا اُس نے حسنۂ دنیا کو بھی پا لیا تھا اور حسنۂ آخرت کو بھی! اس مختصر سے کلمہ میں یہ نمایاں اشارہ موجود ہے کہ پاکیزہ روزی یا حلال رزق کے بغیر اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ عالیہ کا ہونا ممکن نہیں، اور اسی طرح اعمالِ حسنہ یا اخلاقِ عالیہ سے جس شخص کی زندگی خالی ہو، یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنا دامنِ معیشت حرام کی آلائشوں سے بچائے گا اور رزقِ حلال کمانے کے لیے

غیر معمولی جہد و مشقت کرے گا۔ حضورؐ نے بروایت عبداللہ بن مسعود فرمایا کہ رزقِ حلال کا کسب فرض ہے، دراصل جب کوئی شخص پہلی بار ناجائز کمائی حاصل کرنے کے لیے میدان میں بڑھتا ہے تو کسی نہ کسی اخلاقی اصول کو توڑتا ہے، بلکہ بیک وقت ایک سے زیادہ اخلاقی تقاضوں کو پامال کرتا ہے۔ جھوٹ، بددیانتی، کام چوری، ناپ تول میں گڑبڑ، ملاوٹ، غصب، سود، رشوت، جعل سازی، سفارشِ بےجا، عہدہ و اختیار کا ناجائز استعمال یا اسی طرح کی غلط حرکات ہیں جن جن کو وہ مفیدِ مطلب پائے گا، اختیار کرے گا۔ ایسے اقدام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ضمیر زندہ کا جو احساسِ حیا غلط کاموں میں رکاوٹ بنتا ہے وہ پہلے کمزور، پھر غیر مؤثر اور پھر کالعدم ہو جاتا ہے۔ یہی احساسِ حیا جو ایک شعبۂ ایمان ہے، ہمیں خیانتِ نگاہ سے روکتا ہے، قولِ بد سے روکتا ہے، ناشائستگی سے روکتا ہے، دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے روکتا ہے، بے انصافی سے روکتا ہے، بددیانتی سے روکتا ہے، جھوٹ بولنے اور جھوٹ لکھنے اور جھوٹ پر عمل کرنے سے روکتا ہے۔ مگر جو شخص حرام کمائی کی راہ پر پڑتا ہے وہ پہلے اسی احساسِ حیا کا گلا گھونٹتا ہے۔ حرام کے دس روپے حاصل کرنے والا آدمی کسی دوسرے فریق کو تھوڑا سا مالی نقصان ہی نہیں پہنچاتا، بلکہ اپنے اندرون میں ایک گراں بہا قوت کا قتل کر رہا ہوتا ہے۔ پس جس معاشرے میں حرام کمائیاں عام ہو جائیں اور یہ کہا جانے لگے کہ حرام سے بچنا ناممکن ہے، اس معاشرے میں لازمی طور پر اخلاقی اقدار برباد ہونے لگیں گی۔ آپس کا انسانی احترام ختم ہو جائے گا، بڑوں کا ادب ختم ہو جائے گا۔ چھوٹوں کے لیے شفقت نہیں رہے گی، نسائیت کا وقار اور امومت کا تقدس نہیں رہے گا، وعدوں پر اعتبار نہیں کرے گا، لوگوں میں احساسِ تحفظ ختم ہو جائے گا، بلکہ بات اور آگے بڑھے گی، اور بات بات پر لوگ تشدد کے چھرے نکالنے لگیں گے، ہر معاملے میں دھینگا مشتی ہوگی، طبیعت کا ذرا سا تکدر انتقام کا روپ دھار لے گا، ہر اختلاف پر نفرت بھڑکے گی، ہر ناپسندیدہ واقعہ پر بے قابو اشتعال پیدا ہوگا —— اور ان احوال کے نتیجے میں بہیمانہ جرائم کا ایک طوفان اُمڈ پڑے گا۔ جبھی تو رسولِ مقبولؐ نے فرمایا: حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ۔ یعنی دنیا یا دولتِ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

اب یہ آپ خود سوچ لیجیے کہ کیا آپ ایسے ہی حالات سے دوچار نہیں ہیں۔

اگر اخلاقی قدروں کے نقصان کی وجہ سے زندگی زہرناک بنتی جا رہی ہے تو اس صورتِ حالات

سے جلد نکلنے کی فکر کیجیے، ورنہ جتنا جتنا آگے بڑھیں گے، پیچھے پلٹنا روز بروز مشکل ہوتا جائے گا۔
اس اذیت ناک صورتِ حالات سے نکلنے کی ایک مؤثر صورت یہ ہے کہ آپ اپنے دل کے نہاں خانے میں اُتر کر اپنے خدا سے عہد باندھیے کہ میں رزقِ حلال حاصل کرنے کی بھرپور سعی کروں گا اور حرام کا ایک ذرہ اور ایک قطرہ بھی اپنی زندگی میں داخل نہ ہونے دوں گا۔ میں لمبی چوڑی حسرتوں اور آرزوؤں کے جال میں اپنے آپ کو قید نہیں رکھوں گا، بلکہ جتنی کچھ حلال و طیب روزی مل سکے گی، اسی پر اکتفا کروں گا۔ رزقِ حلال کے سچے طالب کو دوسروں پر رشک و حسد کی عادت چھوڑ کر متوسط یا غریبانہ گذران کو ہنسی خوشی سے قبول کر لینا چاہیے۔ آپ اپنے بیوی بچوں کو حرام سے بچائیں، چاہے آپ کو بہت سی آسائشیں حاصل نہ ہوں۔ آپ اس کی پروا نہ کریں کہ اونچے لوگوں سے آپ کی دوستی نہیں چل سکتی، یا آپ زندگی کی تقریبوں میں ٹھاٹھ باٹھ نہیں دکھا سکتے، یا آپ مفاخرت کے میدان میں دوسروں سے بڑھ نہیں سکتے۔ رزقِ حلال پر بسر ہونے والی زندگی خود اپنے اندر بڑائی رکھتی ہے اور یہ ایسا پودا ہے جو چاہے قد اور پھیلاؤ میں چھوٹا رہے مگر اس پر حسنِ اخلاق کے لالہ و گل کھلا کرتے ہیں۔ رزقِ حرام سے نشوونما پانے والی مصنوعی زندگی کے درخت پر اخلاقی لحاظ سے حنظل اور مغیلاں نمودار ہوتے ہیں۔

اب میں حضور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات بیان کرتا ہوں جو کسی بھی صاحبِ ایمان کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ نے ایک روایت میں اُس شخص کی مثال بیان کی ہے جس کے متعلق حضورؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ لمبا سفر کر کے آتا ہے، اُس پر تھکن طاری ہے اور اُس کا جسم اور لباس غبار آلود ہے، مگر اس کے شوقِ عبادت کا یہ عالم ہے کہ وہ نہایت بے تابی سے خدا کے حضور کھڑا ہو جاتا ہے اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر پکارتا ہے ـــــ "یا ربّ! یا ربّ!" حضورؐ فرماتے ہیں کہ اس کی دعا اور پکار کیا اثر دکھلائے جب کہ اُس کا کھانا حرام کا ہے اور اُس کا لباس حرام کا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دس درہم کا ایسا لباس پہن کر عبادت کرے جس میں ایک درہم حرام کا شامل ہے تو جب تک یہ لباس اُس کے بدن پر ہے، اُس کی کوئی عبادت قبول نہیں ہوتی۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود حضورؐ کا یہ ارشاد ہم تک پہنچاتے ہیں کہ حرام کمائی کا سارے کا سارا مال اگر صدقہ کر دیا جائے تو اُس کا کوئی ثواب نہیں، اور اُس مال سے اگر نان و نفقہ کا انتظام کیا جائے تو اس میں برکت نہیں

ایک روایت اور بحضرت جابرؓ سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ہم تک پہنچاتے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کی ایک روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ وہ گوشت جس کی پرورش حرام سے ہوئی ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا، اُس کی جگہ جہنم میں ہے۔

آدمی دُنیا پرستی کی رَو میں پڑ کر بڑی بڑی حقیقتوں سے غافل رہتا ہے۔ مثلاً ایک حدیث یہ بتاتی ہے کہ آدم کے کسی بیٹے بیٹی کے قدم آخرت کی عدل گاہ کے کٹہرے سے ہل نہیں سکیں گے جب تک وہ چند بنیادی سوالات کا جواب نہ دے لے۔ ان میں سے ایک سوال یہ ہے کہ وَعَن مَالِہٖ مِن اَیْنَ اکتسبَ وفِیمَ اَنْفَقَ۔ نہایت خوفناک سوال ہے۔ ایک ایک پیسے کے متعلق — زمین، مکان، کاروبار، ملازمت، خرید و فروخت — ہر چیز کے بارے میں یہ جواب دینا کہ کونسی آمدنی کہاں سے اور کس طریقے سے حاصل کی گئی اور پھر کن مقاصد و مشاغل کے لیے خرچ کی گئی، کوئی سہل امر نہیں ہے۔ کسٹم اور انکم ٹیکس والوں کے سامنے اس دُنیا میں حساب پیش کرتے ہوئے آپ کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں اور کتنی پریشانی ہوتی ہے۔ مگر آخرت میں تو، نہ دولت کا کوئی حصّہ کالے دھن کی شکل میں لُکایا چھپایا جا سکے گا، نہ حساب کتاب میں کوئی ہیر پھیر چل سکے گا، نہ کوئی وکیل قانونی موشگافیاں کرنے کے لیے درمیان میں ہوگا، اور نہ کوئی درمیانی کارندہ ایسا ہوگا، جسے رشوت دی جا سکے۔ ذرا آج ہی بیٹھ کر اپنی ایک سال، یا ایک ماہ یا ایک ہفتے یا ایک دن کی دولت کا سچا حساب اپنی نگاہوں کے سامنے رکھ کر دیکھیے، کیا آپ کا حساب اپنی نگاہوں میں صاف ستھرا ہے؟ اکلِ اموال بالباطل، یعنی ناجائز طریقوں سے مال ہڑپ کرنا، اور صرفِ اموال برائے تبذیر و اسراف، یعنی گناہ کے ممنوعہ کاموں میں، یا حقیقی ضروریات کو خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر روپیہ اُڑانا، یہ دو بڑی چیزیں ہیں، جن سے اپنے آپ کو بچا لیجیے۔ فقراء یعنی تھوڑی آمدنی رکھنے اور محدود مصارف میں گزر بسر کرنے والوں کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ وہ آخرت کی عدالت سے جلد فارغ ہوں گے اور سستے چھوٹیں گے اور دولت مندوں سے بہت پہلے جنّت میں داخل ہوں گے۔ جب کہ امرا کا حساب بڑی دیر میں مکمل ہوگا۔ امام غزالی نے مکاشفۃ القلوب میں یہ تک لکھا ہے کہ انبیاء میں سے حضرت سلیمان علیہ السّلام، اور صلحاء میں سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تاخیر سے جنت میں داخل ہوں گے، حالانکہ دونوں کے جنتی ہونے میں کوئی شک

نہیں کیا جاسکتا۔ اسی وجہ سے حضورؐ نے رزقِ کفاف پر اکتفا کرنے کی ترغیب دلائی۔ افلح من اسلم وکان رزقہ کفافا۔ یعنی فلاح پائی اُس شخص نے جس نے اسلام کو اختیار کیا اور جو گذر بسر کی روزی رکھتا ہے۔

ایک سبق یہ دیا کہ دُنیا کو اور اس کے اموال اور نعمتوں کو متاعِ غرور سمجھو اور دُنیا میں اس طرح وقت گذارو جیسے تم پردیسی اور مسافر ہو۔ دوسرا سبق یہ دیا کہ موت کو یاد رکھو، کیوں کہ بالفاظ حضرت انسؓ "موت کی یاد گناہوں کو مٹاتی اور دُنیا پر فریفتہ ہونے سے بچاتی ہے۔" اور بالفاظ حضرت کعبؓ "جس نے موت کو جان لیا، اُس پر دین کے مصائب اور غم آسان ہو گئے۔" تیسرا سبق یہ دیا کہ دُنیوی معاملات میں باہمی مفاخرت اور تکاثر سے بچو، تکاثر سے مراد ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ تلقین یہ فرمائی کہ اُمورِ دُنیا میں اپنے سے کم مرتبہ لوگوں کو دیکھو کہ کثیر التعداد غریب لوگ کس طرح گذر کر رہے ہیں، اور دینی خدمات، سعیِ دعوت و اصلاح انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد برائے غلبۂ حق میں اپنے سے اُوپر والوں کو دیکھو اور اُن سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ جو شخص ہمہ تن لوگوں کے بنائے ہوئے معیارِ زندگی کی پرستش کرنے لگتا ہے بے بنیاد حسرتوں اور آرزوؤں کے شیش محل کھڑے کرتا ہے، وہ آہستہ آہستہ اس ڈگر پر پڑ جاتا ہے کہ ایک خاص معیار کے مطابق نمائش، آرائش اور آسائش کے اسباب جمع کرنے کے لیے ناجائز آمدنیوں کے راستے نکالے۔ ناکام ہوتا ہے تو قلق و یاس میں پڑ کر نفسیاتی کیس بن جاتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے تو معیار پرستی اُسے خدا اور اُس کے بندوں کے لیے مال خرچ کرنے کا اذن نہیں دیتی۔ وہ لازماً اسراف اور تبذیر کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔

آج کچھ لوگوں نے یہ کلیہ بنالیا ہے کہ صاحب! رزق کو حرام کی آمیزش سے پاک رکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ کلیہ اُن لوگوں کا ہے جو گذر بسر کی حلال روزی پر اکتفا کرنے والے نہیں ہیں، بلکہ ہزاروں لاکھوں کی آمدنیاں سمیٹنے کے درپے ہیں، اور پلاٹوں، کوٹھیوں، کاروں اور دیگر بڑے بڑے مفاد کو سمیٹنا چاہتے ہیں۔ یہ اپنا کلیہ بیان کر کے اُن بزرگوں اور نوجوانوں کو مایوس کر کے کسبِ رزقِ حلال کی جنگ میں شکست تسلیم کرنے پر آمادہ کرتے ہیں جو حرام کی روزی سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر کچھ لوگوں کا طرزِ استدلال یہ ہے کہ جب اضطرار اور مجبوری سے کچھ نہ کچھ حرام کی آلائشیں قبول کرنا ہی

پڑتی ہیں تو پھر کیوں نہ کھل کر حرام خوری کی جائے تاکہ کچھ رہنے بھی۔ حالانکہ اضطرار اور مجبوری کی رعایت خدا کے ہاں وقتی اور جزئی امور پر تو شاید مل جائے، لیکن حرام کے خوانِ یغما پر کھلے ہاتھ مارنے والوں کا معاملہ ایسا نہیں جس پر وہ خدا کے سامنے معذرت پیش کر سکیں۔

آخر میں مجھے اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے کہ ہزار بگاڑ پھیلنے کے باوجود امتِ محمدیہ اور خود ملتِ پاکستان میں ایسے لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو حرام کی ترغیبات سے لڑ لڑ کر، رزقِ حلال تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں۔ ہمارے سارے اخلاقی استحکام اور قومی فلاح کا دار و مدار اسی عنصر پر ہے۔ یہ لوگ اگر اٹھ کھڑے ہوں اور رزقِ حلال کو دین کے ایک اہم تقاضے کی حیثیت سے پھیلائیں تو تھوڑی مدت میں اخلاقی لحاظ سے ہمارا نقشہ بدل سکتا ہے۔ حکومت کو قوانین کے ذریعے حرام کے راستے بند کرنے چاہئیں۔ ادیبوں اور صحافیوں کو اپنا زورِ قلم اس مقصد کے لیے صرف کرنا چاہیے، خطیبوں اور واعظوں کو جذبات پر عوام کو لڑانے کے بجائے اتحاد بین المسلمین اور رزقِ حلال جیسے موضوعات پر کلام کرنا چاہیے۔ مشائخ کو بیعت لیتے ہوئے اپنے مریدوں سے اقرار کرانا چاہیے کہ وہ رزقِ حلال کی پابندی کریں گے، دینی اور سیاسی جماعتوں کے دستوروں میں ایسی ایک شق ضرور ہونی چاہیے کہ ہمارے ارکان کو .... رزقِ حرام سے اجتناب کرنا ہوگا۔ جدید و قدیم معلمین کو شاگردوں میں یہ جذبہ بیدار کرنا چاہیے کہ اپنی آئندہ زندگی میں حلال و طیب روزی پر اکتفا کریں، خصوصاً ہمارے ہاں کی بیگمات کو یہ طے کر لینا چاہیے کہ وہ حرام آمدنی کو اپنے گھر میں داخل نہ ہونے دیں گی اور نہ گھر والوں سے ایسے اسباب، ایسے لباسوں اور زیورات یا ایسی تقریبوں کا مطالبہ کریں گی، جن کو ہم پہنچانے کے لیے وہ رزقِ حرام کی چراگاہ میں داخل ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ نیز وہ عہد کر لیں کہ اپنے کسی بچے کے منہ میں دودھ کا ایک ایسا قطرہ بھی نہ جانے دیں گی جس میں حرام کا زہر ملا ہوا ہو۔ اور ان سب عناصر کو اگر ریڈیو اور ٹیلی وژن کی پشت پناہی بھی حاصل ہو جائے تو مساعیٔ اصلاح میں دس گنا زیادہ زور پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ مہم کچھ عرصہ چلے تو اخلاقی قدروں کی ٹمٹماتی ہوئی شمعیں پوری طرح روشن ہو جائیں اور سارا معاشرہ جگمگا اٹھے۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

اختلافات کا صحت مندانہ تعمیری اسلوب

اقتباس کردہ اختر حجازی صاحب

اس عنوان سے مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی دینی و سیاسی تحریروں کے منتخب اقتباسات پیش کرنے کا سلسلہ ترجمان القرآن میں شروع کیا جا رہا ہے۔ تاکہ مؤسس ترجمان القرآن اور عالمی تحریکِ اسلامی کے داعی و قائد سے قارئین کا ذہنی رابطہ قائم رہے۔

(ایڈیٹر)

انسانی طبائع کا اختلاف ایک فطری چیز ہے جس سے کسی حال میں مفر نہیں۔ انسان جب تک انسان ہے اس کا اپنا ایک انفرادی مزاج، انفرادی مذاق اور انفرادی ذہن لازماً رہے گا اور یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ تمام انسان ہر لحاظ سے یک رنگ و ہم آہنگ ہو جائیں۔

دوسری طرف اجتماعی زندگی بسر کرنا بھی خود انسان ہی کی فطرت کا ایک ناگزیر تقاضا ہے جس سے فرار ممکن نہیں، اور یہ اجتماعیت کبھی قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ افرادِ انسانی کے درمیان معاملات میں تعاون، خیالات میں موافقت، اغراض و مقاصد میں اشتراک، اور اختلافات میں رواداری نہ ہو۔ ایک بڑا معاشرہ تو درکنار، ایک گھر بھی بخیریت نہیں چل سکتا اگر اس میں رہنے والوں کی انفرادیت بات بات پر ایک دوسرے سے ٹکراتی رہے اور ان کے اختلافات اُن کے درمیان موافقت کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے دیں۔

انسانی فطرت کے یہ دو مختلف اور بڑی حد تک متضاد تقاضے ہیں اور ایک کامیاب نظامِ زندگی کی تعمیر کا سارا انحصار اس پر ہے کہ ان کے تصادم کو روکا جائے اور ان میں مصالحت کی ایسی راہ تلاش کر لی جائے کہ یہ دونوں تقاضے ایک ساتھ پورے ہو سکیں۔ دنیا میں جہاں بھی تعمیری ترقی ہوئی ہے، اسی وقت

ہوتی ہے جب معاشرے نے کچھ ایسے بنیادی اُصول پالیے ہیں جن پر اس کے زیادہ سے زیادہ افراد متفق ہوں اور اس اتفاق میں ایسی گنجائش رکھ لی گئی ہو کہ اختلافِ طبائع کے تقاضے بھی اسی کے اندر پورے ہو جائیں۔ لیکن جہاں ایسا نہیں ہو سکا ہے وہاں تعمیر رُک گئی ہے اور تخریبی قوتیں کام کرنے لگی ہیں۔

بے اختیاری کے زمانے میں جو کچھ اور جیسے کچھ ہمارے حالات تھے، اختیار پا کر بھی ہم اُن کو بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے کوئی کامیاب اور قابلِ ذکر کوشش نہ کر سکے۔ ہمارا دستور وہی ہے۔ انتظامی ڈھانچہ اور اس کا مزاج وہی ہے۔ قانونی نظام وہی ہے، تعلیمی نظام وہی ہے، معاشی نظام وہی ہے، اخلاق و معاشرت کا حال وہی ہے، مذہبی حالت وہی ہے۔ کسی چیز کی اصلاح و ترقی کے لیے بھی ہم کوئی قدم نہ اُٹھا سکے۔ بلکہ قدم اُٹھانے کے لیے اس کی سمت تک متعین نہ کر سکے۔ آزادی کے لیے ہماری سعی و جہد تو اسی غرض کے لیے تھی کہ ہم غلامی کے دَور کی حالت پر راضی نہ تھے اور اسے بدلنے اور بہتر بنانے کے لیے اپنی مرضی استعمال کرنا چاہتے تھے، مگر کوئی چیز ایسی ہے جس کی وجہ سے ہم آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنی مرضی مؤثر طریقے سے استعمال نہ کر سکے۔

وہ چیز کیا ہے؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہمارے ہاں اختلافات کی فصلِ بہار آئی ہوئی ہے۔ فکر و نظر کے اختلافات، اغراض اور خواہشات کے اختلافات، گروہوں اور ٹولیوں کے اختلافات، علاقوں اور صوبوں کے اختلافات نت نئی شان سے اُبھرتے رہے ہیں اور اُبھرتے چلے آرہے ہیں۔ جو کچھ ایک بنانا چاہتا ہے دوسرا اُس میں مزاحم ہوتا ہے اور دوسرا جو کچھ بنانا چاہتا ہے کوئی تیسرا اُسے بگاڑنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔ اِس صورتِ حال نے ہر پہلو میں تعمیر روک رکھی ہے اور تخریب آپ سے آپ اپنا کام کر رہی ہے خواہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا دل سے خواہاں نہ ہو۔

اگر ہم اپنے دشمن آپ نہیں ہو گئے ہیں تو ہمیں اختلافات اور مخالفت و مزاحمت کے اس اندھے جنون سے افاقہ پانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنے ذہن کو اُن بنیادوں کی تلاش میں لگانا چاہیے

جن پر سب، یا کم از کم اکثر باشندگانِ پاکستان متفق ہو سکیں، جن پر متفق ہو کر ہماری قوتیں اپنی تخریب کے بجائے اپنی تعمیر میں لگ سکیں۔

ایسی بنیادیں تلاش کرنا درحقیقت مشکل نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہمارے ذہن وجوہِ نزاع کرید کرید کر نکالنے کے بجائے اساساتِ اتفاق ڈھونڈھنے کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ ذرا سا زاویۂ نظر بدل جائے تو ہم بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ اساساتِ اتفاق ہمارے قریب ہی موجود ہیں۔ ہم انھیں اپنے مذہب میں پا سکتے ہیں، دنیا کے تجربات میں پا سکتے ہیں، اور عقلِ عام کی صاف اور صریح رہنمائی میں پا سکتے ہیں۔

یہ سطور اسی غرض سے لکھی جا رہی ہیں کہ چند اُن بنیادی اُصولوں کی نشان دہی کی جائے جن پر اتفاق ممکن ہے تاکہ سوچنے والے اُن پر غور کریں۔

سب سے پہلے ہم اُن اُصولوں کو لیتے ہیں جو ملک میں تخریبی فضا کے بجائے تعمیری فضا پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں، اس لیے کہ اگر فضا ہی سازگار نہ ہو تو ملک کے نظامِ زندگی کی بنیادوں پر گفتگو کرنا لاحاصل ہے۔

اوّلین چیز جس پر ملک کے تمام مختلف الخیال گروہوں اور اشخاص کو اتفاق کرنا چاہیے وہ صداقت اور باہمی انصاف ہے۔ اختلاف اگر ایمان داری کے ساتھ ہو، دلائل کے ساتھ ہو، اور اسی حد تک رہے جس حد تک فی الواقع اختلاف ہے تو اکثر حالات میں یہ مفید ثابت ہوتا ہے، کیونکہ اس طرح مختلف نقطہ ہائے نظر اپنی صحیح صورت میں لوگوں کے سامنے آجاتے ہیں اور لوگ انھیں دیکھ کر خود رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ ان میں سے کس کو قبول کریں۔ تاہم اگر وہ مفید نہ ہو تو کم سے کم بات یہ ہے کہ مضر نہیں ہو سکتا۔ لیکن کسی معاشرے کے لیے اس سے بڑھ کر نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اس میں جب بھی کسی کو کسی سے اختلاف ہو تو وہ "جنگ میں سب کچھ حلال ہے" کا ابلیسی اصول اختیار کر کے اُس پر ہر طرح کے جھوٹے الزامات لگائے، اُس کی طرف جان بوجھ کر غلط باتیں منسوب کرے، اُس کے نقطۂ نظر کو قصداً غلط صورت میں پیش کرے، سیاسی اختلاف ہو تو اُسے غدار اور دشمنِ وطن ٹھیرائے، مذہبی اختلاف ہو تو اُس کے پورے دین و ایمان کو متہم کر ڈالے اور ہاتھ دھو کر اس کے

پیچھے اس طرح پڑ جاتے ہیں کہ گویا اب مقصدِ زندگی بس اسی کو نیچا دکھانا رہ گیا ہے۔ اختلاف کا یہ طریقہ نہ صرف اخلاقی لحاظ سے معیوب اور دینی حیثیت سے گناہ ہے، بلکہ عملاً بھی اس سے بے شمار خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی بدولت معاشرے کے مختلف عناصر میں باہمی عداوتیں پرورش پاتی ہیں۔ اس سے عوام دھوکے اور فریب میں مبتلا ہوتے ہیں اور اختلافی مسائل میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اس سے معاشرے کی فضا میں وہ تکدر پیدا ہو جاتا ہے جو تعاون و مفاہمت کے لیے نہیں بلکہ صرف تصادم و مزاحمت ہی کے لیے سازگار ہوتا ہے۔ اس میں کسی شخص یا گروہ کے لیے عارضی منفعت کا کوئی پہلو ہو تو ہو، مگر بحیثیتِ مجموعی پوری قوم کا نقصان ہے جس سے بالآخر وہ لوگ خود بھی نہیں بچ سکتے جو اختلاف کے اس بیہودہ طریقے کو مفید سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ بھلائی اسی میں ہے کہ ہمیں کسی سے خواہ کیسا ہی اختلاف ہو، ہم صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اُس کے ساتھ ویسا ہی انصاف کریں جیسا ہم خود اپنے لیے چاہتے ہیں۔

دوسری چیز جو اتنی ہی ضروری ہے، اختلافات میں رواداری، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش اور دوسروں کے حقِ رائے کو تسلیم کرنا ہے۔ کسی کا اپنی رائے کو حق سمجھنا اور عزیز رکھنا تو ایک فطری بات ہے، لیکن رائے رکھنے کے جملہ حقوق اپنے ہی لیے محفوظ کر لینا انفرادیت کا وہ مبالغہ ہے جو اجتماعی زندگی میں کبھی نہیں نبھ سکتا۔ پھر اس پر مزید خرابی اُس مفروضے سے پیدا ہوتی ہے کہ "ہماری رائے سے مختلف کوئی رائے ایمانداری کے ساتھ قائم نہیں کی جا سکتی، لہٰذا جو بھی کوئی دوسری رائے رکھتا ہے وہ لازماً بے ایمان اور بدنیت ہے۔" یہ چیز معاشرے میں ایک عام بدگمانی کی فضا پیدا کر دیتی ہے، اختلافات کو مخالفتوں میں تبدیل کر دیتی ہے اور معاشرے کے مختلف عناصر کو، جنہیں بہرحال ایک ہی جگہ رہنا ہے، اس قابل نہیں رہنے دیتی کہ وہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ کر کسی مفاہمت و مصالحت پر پہنچ سکیں۔ اس کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ کہ مدتِ دراز تک معاشرے کے عناصرِ ترکیبی آپس کی کشمکش میں مبتلا رہیں، اور اُس وقت تک کوئی تعمیری کام نہ ہو سکے جب تک کوئی ایک عنصر باقی سب کو ختم نہ کر دے۔ یا پھر سب لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں اور خدا کسی دوسری قوم کو تعمیر کی خدمت سونپ دے۔ بدقسمتی سے ناروا داری اور بدگمانی اور خود پسندی

کا یہ مرض ہمارے ملک میں ایک وبائے عام کی صورت اختیار کر چکا ہے جس سے بہت ہی کم لوگ بچے ہیں ہیں۔ حکومت اور اس کے اربابِ اقتدار اس میں مبتلا ہیں۔ سیاسی پارٹیاں اس میں مبتلا ہیں۔ مذہبی گروہ اس میں مبتلا ہیں۔ اخبار نویس اس میں مبتلا ہیں۔ حتیٰ کہ بستیوں اور محلوں اور دیہات کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں تک اس کے زہریلے اثرات اُتر گئے ہیں۔ اس کا مداوا صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے وہ لوگ جو اپنے اپنے حلقوں میں نفوذ و اثر رکھتے ہیں، اپنی ذہنیت تبدیل کریں اور خود اپنے طرزِ عمل سے اپنے زیرِ اثر لوگوں کو تحمل و برداشت اور وسعتِ ظرف کا سبق دیں۔

تیسری چیز جسے تمام اُن لوگوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں کام کرتے ہوں یہ ہے کہ ہر شخص اپنی توتیں دوسروں کی تردید میں صرف کرنے کے بجائے اپنی مثبت چیز پیش کرنے پر صرف کرے۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات کسی چیز کے اثبات کے لیے اس کے غیر کی نفی ناگزیر ہوتی ہے، مگر اس نفی کو اسی حد تک رہنا چاہیے جس حد تک ناگزیر ہو، اور اصل کام اثبات ہونا چاہیے نہ کہ نفی۔ افسوس ہے کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں زیادہ تر زور اس بات پر صرف کیا جاتا ہے کہ دوسرے جو کچھ بھی کر رہے ہیں اُس کی مذمت کی جائے اور اس کے متعلق لوگوں کی رائے خراب کر دی جائے۔ بعض لوگ تو اس منفی کام سے آگے بڑھ کر سرے سے کوئی مثبت کام کرتے ہی نہیں، اور کچھ دوسرے لوگ اپنے مثبت کام کے فروغ کا انحصار اس پر سمجھتے ہیں کہ میدان میں ہر دوسرا شخص جو موجود ہے اس کی اور اُس کے کام کی پہلے مکمل نفی ہو جائے۔ یہ ایک نہایت غلط طریق کار ہے اور اس سے بڑی قباحتیں رونما ہوتی ہیں۔ اس سے تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے تعصبات اُبھرتے ہیں، اس سے عام بے اعتباری پیدا ہوتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سے عوام کو تعمیری طرز پر سوچنے کے بجائے تخریبی طرز پر سوچنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

یہ روش خصوصیت کے ساتھ موجودہ حالت میں تو ہمارے ملک کے لیے بہت ہی زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس وقت ہماری قومی زندگی میں ایک بڑا خلا پایا جاتا ہے جو ایک (دینی یا سیاسی) قیادت پر سے عوام کا اعتماد اُٹھ جانے اور دوسری کسی قیادت پر نہ جمنے کا نتیجہ ہے۔ اس خلا کو اگر کوئی چیز بھر سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اپنا جو کچھ اور جیسا کچھ بھی مثبت کام اور پروگرام رکھتی

ہیں وہ لوگوں کے سامنے آئے اور لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع ملے کہ کون کیا کچھ بنا رہا ہے؟ کیا کچھ بنانا چاہتا ہے، اور کس کے ہاتھوں کیا کچھ بننے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہی چیز آخر کار ایک یا چند جماعتوں پر قوم کو مجتمع کر سکے گی اور اجتماعی طاقت سے کوئی تعمیری کام ممکن ہوگا۔ لیکن اگر صورتِ حال یہ رہے کہ ہر ایک اپنا اعتماد قائم کرنے کے بجائے دوسروں کا اعتماد ختم کرنے میں لگا رہے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ کسی کا اعتماد بھی قائم نہ ہو سکے گا اور ساری قوم بن سری ہو کر رہ جائے گی۔

ایک اور بات جسے ایک قاعدۂ کلیہ کی حیثیت سے سب کو مان لینا چاہیے یہ ہے کہ اپنی مرضی دوسروں پر زبردستی مسلط کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ جو کوئی بھی اپنی بات دوسروں سے منوانا چاہتا ہو وہ جبر سے نہیں بلکہ دلائل سے منوائے، اور کوئی اپنی کسی تجویز کو اجتماعی پیمانے پر نافذ کرنا چاہتا ہو وہ بزورِ نافذ کرنے کے بجائے ترغیب و تلقین سے لوگوں کو راضی کر کے نافذ کرے۔ محض یہ بات کہ ایک شخص کسی چیز کو حق سمجھتا ہے یا ملک و ملت کے لیے مفید خیال کرتا ہے، اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ اُٹھے اور زبردستی اس کو لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش شروع کر دے۔ اس طریق کار کا لازمی نتیجہ کشمکش، مزاحمت اور بدمزگی ہے۔ ایسے طریقوں سے ایک چیز مسلط ... تو ہو سکتی ہے مگر کامیاب نہیں ہو سکتی، کیوں کہ کامیابی کے لیے لوگوں کی قبولیت اور دلی رضامندی ضروری ہے۔ جن لوگوں کو کسی نوع کی طاقت حاصل ہوتی ہے، خواہ وہ حکومت کی طاقت ہو یا مال و دولت کی یا نفوذ و اثر کی، وہ بالعموم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انھیں اپنی بات منوانے اور اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رضائے عام کے حصول کا لمبا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بس طاقت کا استعمال کافی ہے۔ لیکن دُنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی ہی زبردستیوں نے بالآخر قوموں کا مزاج بگاڑ دیا ہے۔ ملکوں کے نظام تہ و بالا کر دیے ہیں، اور اُن کو پُرامن ارتقاء کے راستے سے ہٹا کر بے تکے تغیرات و انقلابات کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ پاکستان کے باثر لوگ اگر واقعی اپنے ملک کے خیر خواہ ہیں تو انہیں دھونس کے بجائے دلیل سے اور جبر کے بجائے ترغیب سے کام لینے کی عادت ڈالنی چاہیے اور اسی طرح پاکستان کے عام باشندے بھی اگر اپنے بدخواہ نہیں ہیں تو انہیں اس بات پر متفق ہو جانا چاہیے کہ وہ یہاں کسی کی دھونس اور زبردستی نہ چلنے دیں گے۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی چھوٹی چھوٹی عصبیتوں کو ختم کر کے مجموعی طور پر پورے ملک اور ملت کی بھلائی کے نقطۂ نظر سے سوچنے کا خوگر ہونا چاہیے۔ ایک مذہبی فرقے کے لوگوں کا اپنے ہم خیال لوگوں سے مانوس ہونا، یا ایک زبان بولنے والوں کا اپنے ہم زبانوں سے قریب تر ہونا، یا ایک علاقے کے لوگوں کا اپنے علاقے والوں ...... سے دلچسپی رکھنا تو ایک فطری بات ہے۔ اس کی نہ کسی طرح مذمت کی جا سکتی ہے اور نہ اس کا مٹ جانا کسی درجے میں مطلوب ہے۔ مگر جب اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے گروہ اپنی محدود دلچسپیوں کی بنا پر تعصب اختیار کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے گروہی مفاد یا مقاصد کے لیے معرکہ آرائی پر اتر آتے ہیں تو یہ چیز ملک اور ملت کے لیے سخت نقصان دہ بن جاتی ہے۔ اس کو اگر نہ روکا جائے تو ملک پارہ پارہ ہو جاتے اور ملت کا شیرازہ بکھر جاتے جس کے برے نتائج سے خود یہ گروہ بھی نہیں بچ سکتے۔ لہٰذا ہم میں سے ہر شخص کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس فرقے، قبیلے، نسل، زبان یا صوبے سے اس کا تعلق ہو اس کے ساتھ اس کی دلچسپی اپنی فطری حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ یہ دلچسپی جب بھی تعصب کی شکل اختیار کرے گی، تباہ کن ثابت ہو گی۔ ہر تعصب لازماً جواب میں ایک تعصب پیدا کر دیتا ہے اور تعصب کے مقابلے میں تعصب کشمکش پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر بھلا اس قوم کی خیر کیسے ہو سکتی ہے جس کے اجزائے ترکیبی آپس ہی میں برسرِ پیکار ہوں۔

ایسا ہی معاملہ سیاسی پارٹیوں کا بھی ہے۔ کسی ملک میں اس طرح کی پارٹیوں کا وجود اگر جائز ہے تو صرف اس بنا پر کہ ملک کی بھلائی کے لیے جو لوگ ایک خاص نظریہ اور لائحہ عمل رکھتے ہوں انہیں منظم ہو کر اپنے طریقے پر کام کرنے کا حق ہے۔ لیکن یہ حق دو ضروری شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ فی الواقع نیک نیتی کے ساتھ "ملک کی بھلائی" ہی کے لیے خواہاں اور کوشاں ہوں، اور دوسری شرط یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ان کی مسابقت یا مصالحت اصولی ہو اور معقول اور پاکیزہ طریقوں تک محدود رہے۔ ان میں سے جو شرط بھی مفقود ہو گی اس کا فقدان پارٹیوں کے وجود کو ملک کے لیے مصیبت بنا دے گا۔ اگر ایک پارٹی اپنے مفاد اور اپنے چلانے والوں کے مفاد ہی کو اپنی سعی و جہد کا مرکز و محور بنا بیٹھے اور اس فکر میں ملک کے مفاد کو پرواہ نہ کرے تو وہ سیاسی پارٹی نہیں بلکہ قزاقوں کی ٹولی ہے۔ اور اگر مختلف پارٹیاں مسابقت میں ہر طرح کے جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرنے لگیں اور مصالحت کسی اصول پر کرنے کے بجائے اختیار و اقتدار کے بٹوارے کی خاطر کیا کریں تو ان کی جنگ بھی ملک کے لیے تباہ کن ہو گی اور صلح بھی۔

(اشارات ترجمان القرآن۔ جلد ۴۴، عدد ۵)

عقلِ وجدانی کے مظاہرات

پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

عقلِ وجدانی کی سرگرمی انسان کی زندگی میں ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ انسان کا جذبۂ اندرون ہر دم خارج میں جلوۂ حقیقت کا متلاشی رہتا ہے۔ وہ جہاں کہیں حسن و کمال کی کوئی جھلک دیکھ لیتا ہے یا رفعت و تقدیس کا کوئی مظہر دیکھ لیتا ہے تو اندرونی کشش کے تحت اُس کا متوالا بن جاتا ہے۔ اس کی بزرگداشت بلکہ تقدیس شروع کر دیتا ہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس پر اس جلوہ کے نقائص ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ اس سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اس کی شکست و ریخت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ پھر از سرِ نو جلوۂ حق کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی جلوۂ حق اس کا دل لبھاتا ہے۔ پھر کوئی نقص ظاہر ہو جاتا ہے۔ پھر وہ بیزار ہو جاتا ہے۔ پھر شکست و ریخت کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ عقلِ وجدانی کی سرگرمی، تلاش و جستجو، توقیر و تقدیس اور پھر شکست و ریخت کی صورت میں جاری رہتی ہے ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

انسان کے اندرون میں جلوۂ حقیقت کا جو انعکاس موجود ہے وہ اُس کو خاموش بیٹھنے نہیں دیتا۔ وہ اس کو نئی روشنی فراہم کرتا ہے اور پھر وہ نئے جذبے سے تلاشِ حقیقت کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح عقلِ وجدانی کا سفر جاری رہتا ہے۔ صوفیائے کرام اس کو "سفر در وطن" کی معنی خیز اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسانیت کا قافلہ اوّل روز سے اس سفر پر روانہ ہے۔ اب اپنی اپنی کوشش اور اپنا اپنا ظرف ہے۔ کوئی چند قدم چل کر رہ گیا، کوئی درمیان میں کسی سنگِ راہ پر اٹک گیا

اور کوئی مسلسل سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس سفر کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

چوں نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

ایک دوسرے مقام پر وہ کہتے ہیں ؎

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

عقلِ کلی عقلِ استدلالی سے مختلف ہے۔ عقلِ استدلالی کا رُخ خارجی دُنیا کی طرف ہے۔ عقلِ کلی کا رُخ دل کی باطنی دُنیا کی طرف ہے۔ عقلِ تجزیاتی مادی ماحول کو مسخر کرنا چاہتی ہے، عقلِ تخلیقی جذبۂ اندروں کا ظہور چاہتی ہے۔ وہ باطنی تصورات کے تحت خارجی دُنیا کو حسین و جمیل بنانا چاہتی ہے۔ عقلِ استدلالی مادی دُنیا پر قاہری کرنا چاہتی ہے۔ عقلِ وجدانی دلبری کرنا چاہتی ہے۔ وہ عرفانِ حق اور تقربِ حقیقتِ کبریٰ چاہتی ہے۔ جس طرح خارجی دُنیا کے مظاہرات بے اندازہ اور بے شمار ہیں، اُسی طرح باطنی دُنیا کے عجائبات بھی لامتناہی ہیں، جس طرح خارجی دُنیا میں عقلِ استدلالی کی فتوحات پر ایک عالم محوِ حیرت ہے، اُسی طرح باطنی دُنیا میں عقلِ وجدانی کے کارنامے بھی حیرت انگیز ہیں ؎

عرشِ معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود

عقلِ وجدانی اور استدلالی کے اس تقابل سے کسی شخص کو یہ گمان نہ گزرے کہ یہ ایک دوسرے کی ضد واقع ہوتی ہیں۔ ایسا گمان کرنا نادانی ہوگا۔ مذکورہ سادہ تقابل محض تفہیم کے لیے ہے، ورنہ اُن کے درمیان باہمی تعاون ہے۔ شعور و ادراک، فکر و فہم کی کسی نوع کی بھی سرگرمی ہو، جب بھی وہ معرضِ ظہور میں آئے گی، جب بھی وہ زبان سے یا قلم سے ظاہر ہوگی، وہ ضرور عقلِ استدلالی کے تعاون سے ظاہر ہوگی۔ عقلِ استدلالی کے اُصول و قواعد کے تحت ظاہر ہوگی۔

منطق کے اصول کے تحت ظاہر ہوگی، صرف و نحو کے قواعد کے تحت ظاہر ہوگی - پردۂ ظہور میں آنے کے بعد عقلِ استدلالی کی عالمگیری مسلم ہے۔ در حقیقت ایک سے دوسرے کی تکمیل ہوتی ہے۔ اُن کے درمیان باہمی تعاون ہے۔

عقل و وجدان کے مختلف پہلو ہیں اور مختلف انداز ہیں۔ ان کی اثر انگیزی مختلف افرادِ معاشرہ پر مختلف قوت کے ساتھ اثر انداز ہوتی ہے۔ بعض افراد کے اندر جستجوئے حقیقت کا جاذبہ قوی تر ہو جاتا ہے۔ حق شناسی کے تخم میں سازگار ماحول بہتر آجانے کے سبب کرا پھوٹ نکلتا ہے۔ حقیقتِ کبریٰ کے کسی ایک پہلو پر ان کی نگاہیں مرتکز ہو جاتی ہیں۔ وہ اس پہلو کے شیدا اور متوالے بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی جد و جہد میں بامراد بن جاتے ہیں۔ اُن کا تجسس گوہرِ نایاب سے ہم دست ہو جاتا ہے۔ ایسے چند پہلوؤں کو مثالاً ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ حقیقتِ کبریٰ کا ایک پہلو حق و صداقت ہے۔ صداقت کا مطلب حقیقت سے مطابقت بھی ہے اور واقعیت سے مطابقت بھی ہے۔ مغرب کا یہ دعویٰ کہ صداقت زمان و مکان سے مطابقت کا نام ہے۔ دراصل نارسائی حقیقت کی غمازی کر رہا ہے۔ صدیوں سے انسان اشیاء میں صداقت معلوم کرنے کے درپے ہے۔ مطابقت معلوم کرنے کے لیے کسی معیار اور کسی کسوٹی کا متلاشی ہے، جس پر پرکھ کر اشیاء کی صداقت معلوم کی جا سکے۔ اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے۔ کائنات میں واحد صداقت حقیقتِ کبریٰ ہے۔ اس کا ادنیٰ سا پَرتو روزِ ازل فطرتِ انسانی میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے :- "ہم نے اس کے (انسان) کے اندر اپنی روح پھونک دی" اس جلوۂ حق سے فیض یاب ہو کر علماء اور حکماء نے کائنات کے اندر معلوم اور سہل معیار معلوم کرنے کی جد و جہد شروع کر دی۔ باطن میں موجود انعکاسِ حق کے جلوہ سے مستفید ہو کر بالآخر انسان نے علمِ ریاضی اور علمِ منطق کی صورت میں صداقت کی کسوٹی معلوم کر لی۔ علمِ ریاضی میں اعداد کی صداقت معلوم کی جاتی ہے اور علمِ منطق میں اقوال کی صداقت معلوم کی جاتی ہے۔ بلاشبہ صدیوں کی جد و جہد کے بعد یہ دونوں علم پختہ ہوئے ہیں۔

ان دونوں علوم کی اب یہ قدر ہے اور یہ مرتبہ ہے کہ فکرِ انسانی کا کوئی مظہر ہو، ذہنِ انسانی کی کوئی سرگرمی ہو، عقلِ استدلالی کا کوئی انکشاف ہو، جب تک وہ ریاضی اور منطق کے دیئے

ہوئے معیار صداقت سے ہم آہنگ اور مطابق نہیں ہے، وہ ہرگز درست نہیں ہے، وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ دُنیا جہان کے تمام علوم وفنون کے لیے اساس اور بنیاد یہی دو علوم ہیں۔ عالمگیر صداقت کے حامل یہی ہیں۔ دوسرے تمام علوم کے لیے یہ بمنزلہ کسوٹی ہیں۔ دیگر تمام علوم پر ان کی گرفت مسلم ہے۔

یہاں خاص توجہ کی مستحق بات یہ ہے کہ ان دونوں علوم کا منبع کیا ہے۔ جملہ علومِ سائنس اور عمرانیات کا منتہی اشیاء، مادہ، مظاہرِ کائنات ہوتے ہیں۔ عقلِ استدلالی ان مظاہرات کا مطالعہ کرتی ہے تجزیہ اور تحلیل کرتی ہے، پھر نتیجہ اخذ کرتی ہے، پھر اس کی تعمیم اور تجرید عمل میں آتی ہے۔ اس طرح مختلف علوم مدوّن ہوتے ہیں۔ تمام علوم مادی اشیاء کے مطالعے سے وجود میں آتے ہیں۔ مگر منطق اور ریاضی کے علوم خارجی مظاہرات سے استنباط کردہ نہیں ہیں۔ بلکہ انسان نے ان کو اپنے ذہنِ رسا سے استخراج کیا ہے۔ حق وصداقت کی جو جھلک فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ اس کی ضیا پاشی سے یہ علوم وجود میں آتے ہیں۔ یہ علوم انسان نے اپنے ذہن سے استنباط کیے ہیں۔ ان کے لیے محرک کوئی خارجی مظہر کائنات نہیں ہے۔ بلکہ داخلی جذبہ حق و صداقت ہے۔

ان علوم کی صداقت کی عالمگیریت کا یہ حال ہے کہ کرہ ارضی سے ماوری ماہ و مریخ پر بھی ان کی صداقت مسلم ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مخلوقِ خاکی یعنی انسان کی عقلِ وجدانی کے اختراع کردہ علوم ـــ ریاضی اور منطق کی دسترس سیارگان بلکہ ساری کائنات پر محیط ہے۔ یہ بڑی معنی خیز بات ہے۔ یہاں سے ذہن ایک بہت اہم حقیقت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ کائنات میں جاری وساری حق وصداقت صرف نفسِ انسانی کے آئینہ خانہ میں عکس ریز ہوتا ہے۔ خاکی انسان کے ذہن پر خلاقِ کائنات کے ذہن کا حقیر سا پرتو پڑ چکا ہے۔ اس کے بعد وہ اس قابل ہو سکا کہ حق وصداقت کا عکس خود اپنے قلبِ مصفّیٰ میں دیکھ لے۔ اس کائنات میں خوشنودی کی دولت سے بہرہ مند واحد ہستی انسان کی ہے۔ حق وصداقت کا جلوہ صرف انسان کے نہاں خانۂ دل میں عکس ریز ہوتا ہے۔ مخلوقات میں تشریف وتکریم کا یہ وہ اعلیٰ ترین منصب اور اعزاز ہے جو حضرتِ انسان کو ملا ہے۔ یہ دونوں علوم عقلِ وجدانی کا مظہر ہیں۔

۲ ــــ حقیقتِ کبریٰ کا ایک پہلو خیر و فلاح ہے۔ جو لوگ حقیقت کے اس پہلو سے متاثر ہو جاتے ہیں، بلکہ اس پہلو کے دلدادہ بن جاتے ہیں، اُن کی یہ دُنیا ہی بدل جاتی ہے۔ وہ جود و سخا ایثار و قربانی، خیرات و صدقات کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ جب کہ اردگرد کی ساری دُنیا زر پرستی میں مبتلا ہوتی ہے اور منفعت و اغراض کے پیچھے دوڑ رہی ہوتی ہے، یہ سود و زیاں سے آزاد، کسی منافع کے تصور سے بیگانہ، کسی خارجی مادّی ترغیب سے بے نیاز محض جذبہ اندرون کی بنا پر سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ وہ راہِ خدا میں مخلوقِ خدا پہ خرچ کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ اس راہ میں بے دریغ دولت صرف کرنے میں انہیں طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ مخلوقِ خدا کی خدمت کرنا اپنا وظیفۂ حیات بنا لیتے ہیں۔ رضائے الٰہی اور تقربِ الٰہی کی خاطر وہ سب کچھ کر گذرتے ہیں۔ اس راہ میں زر، محنت، صداقت سب صرف کرتے ہیں اور قلبی طمانیت حاصل کرتے ہیں۔ عام دُنیا والے اُن کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ اُن کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ اُن کا مطمحِ نظر عام انسانوں کی رسائی سے بلند تر ہوتا ہے۔ اُن کا طرزِ عمل عقلِ استدلالی کا فراہم کردہ نہیں ہے۔ دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت سے وہ ارفع ہیں۔ ان کا طرزِ عمل در اصل عقلِ وجدانی کا رہینِ منت ہے۔ وہ ظاہر سے بیگانہ اور باطن کے طلب گار ہیں۔ یہ بھی عقلِ وجدانی کا مظہر ہے۔

۳ ــــ حقیقتِ کبریٰ کے عرفان کا جذبہ بعض افراد کے اندر زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔ وہ حق کے متلاشی بن جاتے ہیں۔ عرفانِ حق کی کشش ان کے لیے غیر معمولی ہوتی ہے۔ وہ ساری عمر اس تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہ تلاش اُن کے لیے مسرت و شادمانی کا سبب ہوتے ہیں۔ درآں حالیکہ دوسرے لوگ اُن کی اس کیفیت کا اندازہ نہیں کر پاتے اور وہ اُن کی تحقیر کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کائناتِ رنگ و بو میں بے حد و شمار تنوع، نیرنگی اور بوقلمونی ہے۔ اس ازدحامِ کثرت و اختلاف و انتشار میں عام انسانوں کی عقل گم اور مبہوت ہو جاتی ہے۔ وہ یہاں نہ کسی نظم و ترتیب کا پتہ چلا سکتے ہیں اور نہ کسی ناظم و صانع کی سراغرسانی کر سکتے ہیں۔ جو لوگ کثرت کے اس جنگل میں گم ہو جاتے ہیں، جن کی عقل اس سے آگے نہیں دیکھتی، وہ ہی در حقیقت مشرک ہیں، مگر اچھی خاصی تعداد ایسے افراد کی ہوتی ہے جو اس کثرت میں وحدت کی راہ پا لیتے ہیں، جو صانع تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ جو لوگ اس نتیجہ پہ عقلِ استدلالی کی مدد سے پہنچتے ہیں وہ حکماء اور فلسفہ کہلاتے ہیں اور جو لوگ

اس نتیجہ پر عقلِ وجدانی کے ذریعہ پہنچتے ہیں وہ اشراقیین اور صوفیا، کہلاتے ہیں۔ اور جو لوگ وحی کی رہنمائی میں یہ سفر طے کرتے ہیں، بس وہ مومن ہیں۔ تصوّف عقلِ وجدانی کی سرگرمی سے ہی عبارت ہے۔ یہ بھی عقلِ وجدانی کا مظہر ہے۔

۴ ــــ حقیقت کے تقرب کا جذبہ بعض افراد میں بہت قوی ہو جاتا ہے۔ وہ حقیقت کے عرفان پر قانع نہیں رہ سکتے۔ ان کا وجدان اسی ذات مجتمع الصفات سے تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس نیرنگ خانۂ رنگ و بُو کے پسِ پردہ حقیقتِ کبریٰ تک رسائی چاہتے ہیں۔ وہ اس ذات کا عرفان اور تقرب چاہتے ہیں، جہاں سے فیضان کا سرچشمہ جاری ہے۔ جہاں سے صفاتِ حسنہ ضو فگن ہیں۔ وہ اپنی تمام تر توجہات اور تمام سعی و جہد کا مرکز اس ذات والا صفات کو بنا لیتے ہیں۔ اسی تلاش میں وہ سرگرداں ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے ہر قسم کی عبادات اور ریاضیاتِ شاقہ برداشت کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے جذبۂ اندروں کی صدا پر جس کو وہ جذبہ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں، ترکِ دنیا کر دیتے ہیں۔ کوئی دور، کوئی زمانہ ان کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ یہ جوگی، سنیاسی، درویش، قلندر، تارک الدنیا صوفی سب کا تعلق ہے تو اسی گروہ سے، مگر یہ اور بات ہے کہ جذبۂ حق رسی نے ان کو کن کن جھمیلوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کسی معاشرے میں ایسے افراد کا موجود رہنا ہی فطرتِ انسانی میں موجود داعیۂ حق کے لیے ثبوت فراہم کرتا ہے۔ کوئی مردِ معقول اس امر سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ بھی عقلِ وجدانی کا مظہر ہے۔

۵ ــــ شعراء، مصوّر اور فن کار اپنے داخلی احساسات اور کیفیات کو خارج میں ایک نظم اور سلیقہ سے پیش کرتے ہیں۔ یہ مثالِ اعلیٰ کے متلاشی ہوتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے ظرف اور مبلغِ علم کی بات ہے کہ کوئی شخص مثالِ اعلیٰ کو پیکرِ محسوس میں تلاش کرتا ہے اور کوئی مادّیت سے ماورا عالمِ لاہوت میں۔ بہرکیف یہ سب عقلِ وجدانی کا مظہر ہیں۔

رسول اکرمؐ کا معیارِ زندگی

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

(۲)

فقر — تزکیۂ نفس کا ہتھیار۔ حضورؐ نے وافر سروسامان اور کثرت مال واسباب کے درمیان تعلیمِ اُمت اور تزکیۂ افراد کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی روشنی میں ایک رضاکارانہ فقر کا نقشہ دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ نقشہ ضبطِ نفس کی حیرت انگیز تصویر پیش کرتا ہے۔ حضورؐ نے اپنا یہ انقلابی معاشی نقشہ اپنے آپ پر ہی نہیں بلکہ اپنے اہل بیت پر بھی نافذ کیا، اس لیے کہ آپ کے اہلِ بیت رہتی دُنیا تک ساری اُمت کے لیے نمونہ اور معلّم وداعی کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے جہاں اُن کو حضورؐ کے اہل بیت ہونے کا شرف حاصل ہوا وہاں اس شرف کے ساتھ انہیں اجتنابِ دُنیا کا سبق بھی اُمت اور دُنیا والوں کے سامنے پیش کرنا ہے، تاکہ اسلامی انقلاب کی حقیقی رُوح قائم رہے۔ بعد میں بعض دوسرے لوگوں بھی اس اسلامی انقلاب کے نقشہ کے مطابق کارِ دُنیا چلانے کی کوشش کی ہے انہیں بہرصورت حضورؐ کے اس طریقِ فقر کی پیروی کرنی پڑی اور جو کوئی اس کی پیروی میں جس درجہ آگے جاسکا اسی قدر وہ اس انقلاب کی رُوح کے قریب تر دُنیا کو نظر آیا۔ اسی چیز سے متاثر ہو کر اقبالؒ نے اپنے بیٹے سے کہا تھا ؎

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ فقیری میں نام پیدا کر

اب ہم اس تعلیمِ فقر کی طرف آتے ہیں جو حضورؐ نے اپنی اُمت کو دی ہے۔

"ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہؐ! میں آپ سے

بہت محبت کرتا ہوں۔" آپؐ نے فرمایا، جو تم کہتے ہو اس پہ غور کر لو۔ اس نے تین بار کہا کہ بخدا میں آپؐ سے محبت کرتا ہوں، آپؐ نے فرمایا " اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو فقر و فاقہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہتھیار فراہم کر لو جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں ان کی طرف فقر و فاقہ سیلاب سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ بڑھتا ہے۔"[1]

فقر کی بنیادی شرط سادہ زندگی گزارنا ہے جس میں کوئی تکلف و اہتمام نہ ہو۔ صاف ستھری اور سادہ زندگی ہو، چنانچہ حضورؐ نے فرمایا:

" سادہ زندگی گزارنا ایمان سے ہے۔"

لیکن ایمان کھرا نہیں ہوتا اگر اسے تپا کر نکھارا نہ جائے۔ کلمہ پڑھ لینا آسان ہے لیکن مشکلات سے لَآ اِلٰہَ سے گزرنا ایک مشکل کام ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

" آزمائش جتنی ہی سخت ہو گی اتنا ہی بڑا انعام ملے گا (بشرطیکہ آدمی مصیبت سے گھبرا کر بھاگ نہ کھڑا ہو) اور اللہ تعالیٰ جب کسی گروہ سے محبت کرتا ہے تو اُن کو مزید نکھارنے اور صاف کرنے کے لیے آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ پس جو لوگ خدا کے فیصلے پہ راضی رہیں اور صبر کریں تو اللہ اُن سے خوش ہوتا ہے اور جو لوگ آزمائش میں اللہ سے ناراض ہوں تو اللہ بھی اُن سے ناراض ہو جاتا ہے۔"[2]

اب ذرا حضورؐ کی وہ دعا سنیے جو آپؐ اکثر اپنی معیشت کے بارے میں اپنے رب سے مانگا کرتے تھے، جیسے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے روایت کیا ہے۔

یا رب اجوع یوماً و اشبع یوماً ۔ فاما الیوم الذی اجوع فیہ فانتضرع الیک وادعوک واما الیوم الذی اشبع فیہ فاحمدک واثنی علیک

" یا الٰہی میں ایک دن بھوکا رہوں اور ایک دن کے لیے کھانے کو ملے۔ بھوک میں

---

[1] ترمذی — راوی عبداللہ بن معقل

[2] رحمۃ للعالمین جلد اوّل صفحہ ۳۱۳ - از شفا ص ۶۲

تیرے سامنے گڑگڑایا کروں اور تجھ سے مانگا کروں اور کہا کہ تیری حمد و ثنا بیان کیا کروں "

چنانچہ اس دعا کا جو نقشہ حضورؐ کے گھر میں تھا اس کا تذکرہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"ایک ایک مہینہ تک ہمارے چولہے میں آگ روشن نہ ہوتی تھی۔ حضور اکرمؐ کا کنبہ کھجور اور پانی پر گزارا کرتا تھا۔ حضورؐ نے مدینہ میں آکر تین دن تک متواتر گیہوں کی روٹی کبھی نہ کھائی۔ جب حضورؐ نے انتقال فرمایا تو آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے پاس بعوض غلہ گروی تھی اور آخری شب پڑوسن کے گھر سے چراغ کے لیے تیل منگایا گیا۔ آپؐ دعا فرمایا کرتے تھے۔ الٰہی آلِ محمدؐ کو بس اتنا دے جتنا وہ پیٹ میں ڈال لیں"۔

دولت مندی کے بارے میں حضورؐ کا نظریہ ہی مختلف تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

"دولت مندی زر و مال کی کثرت سے حاصل نہیں ہوتی، غنی وہ ہے جس کا دل غنی ہے"۔ (بخاری، راوی ابوہریرہؓ)

خود اللہ تعالیٰ نے بھی صبر اور پرہیزگاری کو عزم و ہمت کا نشان قرار دیا ہے۔

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (آل عمران)

اگر تم صبر اور پرہیزگاری اختیار کرو تو یہ ایک عالی ہمتی کا کام ہے۔

اور ظاہر ہے کہ رسول اکرمؐ کی سیرت قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

اپنے کام۔ اپنے ہاتھ سے

قیصر و کسریٰ کے نام فرمان بھیجنے والا اسلامی مملکت کا سربراہ اپنے گھر میں کئی کئی روز فاقے کرتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے کپڑے دھو لیتا، سی لیتا اور اپنے جوتے اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتا تھا۔ لاکھوں روپے عام مسلمانوں میں تقسیم کرنے والے کی اپنی بیٹی فاطمہؓ کے سر پر ثابت چادر تک موجود نہ تھی۔ دوسروں میں لونڈی غلام بانٹنے والے کی لڑکی اپنے ہاتھ سے چکی پیستی، پانی بھرتی اور مشقت کرتی تھی۔ سائل آیا تو گھر میں پڑی ہوئی آٹے کی ٹوکری اٹھا کر پوری کی پوری اسے دی جب کہ اس کے سوا گھر میں اور آٹا موجود نہ تھا۔ گھر میں پڑا ہوا سارا دودھ مہمان کو پلا دیا جب کہ گھر والوں کے لیے ایک قطرہ دودھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ خراج کا کثیر مال آیا تو سارا بیک وقت حاجت مندوں

میں بانٹ دیا اور دامن جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ کسی سائل نے آپؐ کی زبان سے "نہیں" کا لفظ کبھی نہیں سنا۔ ایک بار تو مانگنے والے سے یہ تک کہہ دیا کہ گھر میں کچھ نہیں ہے۔ تم میرے نام پہ قرض لے لو میں چکا دوں گا۔ یہ کھلا اعلان موجود تھا کہ جو مسلمان قرض چھوڑ کر مر جائے اُس کا قرض میں ادا کروں گا۔ اور اُس کا ترکہ اُس کے وارثوں کا ہوگا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے گھر کی زیبائش کے لیے پردہ لٹکایا۔ جس میں تصویریں بھی بنی ہوتی تھیں آپؐ کی نظر پڑی تو فرمایا۔

"عائشہؓ میرے سامنے سے اپنا پردہ ہٹا لو، کیوں کہ اس کی تصاویر میری نماز میں سامنے آتی رہتی ہیں"۔

ایک صحابیؓ نے آپ کو ایک ریشمی جبہ ہدیۃً دیا۔ آپؐ نے اُسے پہن کر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی نہایت ناگواری سے اُسے اُتار کر پھینک دیا۔ اور فرمایا:

"یہ پرہیزگاری کے قابل نہیں ہے"۔

ایک مرتبہ آپ راستے سے گزرے تو ایک بلند عمارت نظر آئی۔ آپؐ نے فرمایا یہ کس کا مکان ہے لوگوں نے ایک انصاری کا نام لیا۔ آپ خاموش ہو گئے اور جب وہ انصاری آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا تو آپؐ نے منہ پھیر لیا۔ انھوں نے دوستوں سے حضورؐ کی ناراضگی کا سبب پوچھا تو لوگوں نے بتایا۔ وہ فوراً گئے اور اُس مکان کو منہدم کر دیا۔ آپؐ دوبارہ اُدھر سے گزرے تو فرمایا "وہ عمارت کیا ہوئی"۔ لوگوں نے سارا واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا:

"ہر وہ مکان جو ضرورت سے زائد ہو صاحبِ خانہ پہ وبال ہے"۔ (ابوداؤد)

ایک بار آپؐ کسی لڑائی سے واپس آئے تو حضرت عائشہؓ نے بہت شوق و محبت سے گھر کو سجا رکھا تھا اور ایک پردہ بھی رنگین لگایا تھا۔ آپؐ تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے سلام کیا، لیکن آپ کے چہرے پہ ناگواری کے آثار تھے اور سلام کا جواب نہ دیا۔ پھر خود اپنے ہاتھ سے پردے کے دو ٹکڑے کر دیے اور فرمایا:

"خدا نے ہمیں مٹی اور پتھر کو آراستہ کرنے کا حکم نہیں دیا ہے" (ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بوریے پر لیٹے۔ بدن مبارک

پر بوریے کا نشان پڑ گیا۔ آپ بیدار ہوئے تو میں سہلانے لگا اور عرض کیا۔

"یا رسول اللہ آپؐ ہمیں اجازت کیوں نہیں دیتے کہ اس پر کوئی چیز بچھا دیا کریں جو آپ کو بوریے سے بچائے۔"

آپؐ نے فرمایا:

"مجھے دنیا سے کیا مطلب۔ میں اور دنیا محض اس طرح ہیں جیسے ایک سوار کہ ایک درخت کے سایے میں آیا، پھر چلا گیا اور اسے پیچھے چھوڑ گیا۔" (ابن سعد)

حضورؐ نے اسی روش کی طرف اپنے صحابہؓ کرام کو بھی اکثر توجہ دلائی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

"خوش نصیب ہے وہ شخص جو اسلام لایا۔ بس ضرورت بھر سامان رکھتا ہے اور جو کچھ اللہ نے اس کو دیا ہے اس پر وہ قانع ہے۔" (مسلم)

حضرت ابن مسعود بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

"قابل رشک دو ہی طرح کے آدمی ہیں۔ ایک وہ کہ جس کو اللہ تعالیٰ مال دے تو وہ اسے اللہ کی راہ میں لٹا دے۔ اور دوسرا وہ جس کو اللہ تعالیٰ حکمت دے تو وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے اور ان کو (دین) سکھلائے۔" (مسلم)

حضرت اسماء بنت حضرت ابوبکر صدیقؓ بیان کرتی ہیں کہ حضورؐ اکرم نے فرمایا:

"اسماء، خرچ کو گن گن کر نہ رکھ، ورنہ تجھے بھی خدا گن گن کر دے گا۔ اور باندھ کر نہ رکھ ورنہ تم پر بھی رزق باندھ دیا جائے گا۔" (بخاری و مسلم)

سادہ مسافرانہ زندگی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے میرا کندھا پکڑا اور متوجہ کر کے فرمایا:

"دنیا میں ایک پردیسی یا راہ چلتے مسافر کی طرح زندگی بسر کرو۔" (بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو ارشاد ہے کہ تم دوسروں پر خرچ کرتے رہو،

ہیں تم پہ خرچ کرتا رہوں گا۔" (بخاری و مسلم)

حضورؐ نے مزید فرمایا:

"اے ابوہریرہؓ حرص و بخل اور ایمان کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔"
(سنن نسائی)

حضرت ابوسعیدؓ خدری روایت کرتے ہیں کہ انصار میں سے کچھ لوگوں نے رسول اکرمؐ سے کچھ طلب کیا تو آپؐ نے اُن کو عطا فرمایا۔ انہوں نے پھر آکر طلب کیا۔ آپ نے پھر اُن کو عنایت فرمایا، یہاں تک کہ جو کچھ آپؐ کے پاس تھا وہ سب ختم ہوگیا اور کچھ باقی نہ رہا۔ تو آپ نے ان انصاریوں سے فرمایا:

"سنو! جو مال و دولت بھی میرے پاس ہوگا اور کہیں سے آئے گا، میں اس کو تم سے بچا کر نہیں رکھوں گا اور اپنے پاس ذخیرہ جمع نہیں کروں گا۔ بلکہ مسلسل تم کو دیتا ہی رہوں گا۔" [۱]

حضورؐ پہلی اسلامی ریاست کے سربراہ تھے اور مالِ غنیمت دُور و نزدیک مختلف سمتوں سے چلا آرہا تھا۔ لیکن اس اسلامی مملکت کے سربراہ کا ایک گھر کھجور کے پتوں کا بنا ہوا تھا جس پہ گھاس پھوس ڈالی گئی تھی۔ ستون کھجور کے تنوں کے تھے اور دروازوں کے کواڑ تک نہ تھے اور دوسری طرف آپؐ کی یہ تعلیم تھی کہ حضرت قتادہ بیان کرتے ہیں۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا۔

"خدا جب اپنے کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو اُس کو دُنیا کے گورکھ دھندوں سے محفوظ رکھتا ہے۔"

اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ حضور اکرمؐ نے جب عتاب بن اُسَید کو مکہ کا گورنر مقرر کیا تو اُن کا معاوضہ ایک درہم روزانہ مقرر کیا گیا۔ گورنر نے لوگوں کے سامنے تحفے تحائف سے اپنی معذوری ظاہر کرتے ہوئے فیصلہ دیا۔

"لوگو، خدا اس شخص کو بھوکا رکھے جو ایک درہم روزانہ ملنے کے بعد بھی بھوکا رہا۔ مجھے چونکہ حضورؐ اکرمؐ نے روزانہ ایک درہم مقرر فرمایا ہے، اس لیے مجھے اور

---

[۱] معارف الحدیث

کسی چیز کی حاجت نہیں ہے۔"

حضور اکرمؐ ایک بار مسجد سے باہر نکلے تو راستہ میں ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی مل گئے۔ تینوں بھوک سے بیتاب ہو کر ہی گھروں سے نکلے تھے۔ آپؐ انہیں ابوالہیثم انصاری کے گھر لے گئے۔ انہوں نے گھر میں کھانا تیار کرنے کا حکم دیا اور خود بکری ذبح کی۔ دسترخوان چنا سب نے مل کر کھایا اور ٹھنڈا پانی پیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا:

"ہم سے قیامت کے دن اس نعمت کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا۔"

حضورؐ کو اپنی اولاد سے بے حد محبت تھی اور حضرت فاطمہؓ سے تو انتہائی محبت تھی اس لیے کہ آخری ایام میں وہی حضورؐ کی زندہ اولاد باقی تھیں۔ حضرت فاطمہؓ سخت غربت کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ چکی پیسنا اور پانی کی مشکیں بھر بھر کر دو میل دور باہر سے لانا۔ پھر گھر کا سارا کام خود سرانجام دینا ان کا روزمرہ کا کام تھا۔ اس سے ہاتھ اور کندھے متاثر ہو گئے تھے۔ انہوں نے پریشان ہو کر حضورؐ سے ایک خادم معاونت کے لیے طلب کیا تو حضورؐ نے صاف انکار کر دیا۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: تم خادم کی خواہش کرتے ہو اور یہاں اصحاب صفہ فقر و فاقہ میں بتلا بیٹھے ہیں۔

ایک بار حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کے ہاتھ میں سونے کا کنگن دیکھا جو انہیں حضرت علیؓ نے لا کر دیا تھا تو حضورؐ نے فرمایا:

"اے میری بیٹی فاطمہ! کیا تجھے یہ پسند ہے کہ لوگ کہیں کہ رسول اللہ کی بیٹی کے ہاتھ میں آگ کا کڑا ہے۔"

یہ کہہ کر آپؐ تشریف لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ نے اسی وقت کڑے کو فروخت کر دیا اور اس کی قیمت سے ایک غلام خریدا۔ پھر اس کو بھی آزاد کر دیا۔ حضورؐ کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا:

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے فاطمہؓ کو دوزخ سے نجات دی۔"

حضورؐ ایک بار نماز پڑھ رہے تھے کہ کہیں سے گھر میں سونا آ گیا جب آپؐ کو اس کی اطلاع ملی تو نماز جلدی جلدی پڑھ لی اور فوراً مسجد سے گھر تشریف لے گئے اور وہ سونا حاجت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ تب آپؐ کو سکون ہوا۔ آپ کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ آپ کے گھر میں سونا موجود رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کو فقر و فاقہ سے کوئی خوف نہ تھا۔ مال و دولت کی فراوانی، خزانہ رکھنے

اور سرمایہ کی موجودگی کو آپ سخت ناپسند کرتے تھے۔ اپنے لیے رزق کے بارے میں بھی آپ یہی دعا کیا کرتے تھے۔

"پروردگار محمدؐ کے گھر والوں کی روزی بس ضرورت کے مطابق دینا۔"

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضور اکرمؐ کے پاس بیٹھے تھے کہ اتنی دیر میں حضرت مصعب بن عمیر ایک پیوند لگی چادر اوڑھے ہوئے حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے جب اُن کو دیکھا تو اُن کی گذشتہ ناز و نعمت اور آرام و آسائش کی حالت کا خیال کر کے رو پڑے۔ پھر فرمایا:

"تمہارا اُس وقت کیا حال ہوگا جب تم صبح میں ایک لباس اور شام میں دوسرا لباس تبدیل کرنے کے قابل ہو جاؤ گے اور اپنے گھروں میں ایسے پردے چڑھانے لگو گے جیسے کعبہ پہ آویزاں کیے گئے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس دن تو ہم موجودہ حالت سے بہتر اور خوب دل جمعی سے عبادت میں مشغول رہیں گے۔ آپؐ نے فرمایا "نہیں بلکہ اُس کی نسبت تم آج کی حالت میں بہتر ہو۔"

حضرت عون بن عبداللہ بن عتبہ کہتے ہیں کہ میں مال داروں کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے باوجود میں انتہائی متفکر اور غمزدہ رہتا تھا۔ مجھ سے زیادہ غمگین شاید ہی کوئی اور ہوگا۔ میں اپنی سواری اور اپنے کپڑوں سے بہتر دوسروں کے کپڑے دیکھا کرتا اور کڑھتا رہتا تھا۔ لیکن جب میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا کہ اگر تم اطمینانِ قلب چاہتے ہو تو اپنے سے نیچے کی طرف دیکھو تاکہ تم خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کر سکو۔ عبداللہ کہتے ہیں اس کے بعد میں نے فقراء اور مساکین کی صحبت اختیار کر لی تو مجھے سکون اور اطمینان حاصل ہوا۔ (باقی)

حقیقتِ تصوّف

پروفیسر طیب شاہین لودھی صاحب

(۳)

صوفیہ کے اسرار و اشارات صوفیہ کی نظر میں علومِ مشاہدات و مکاشفات صرف علمِ اشارہ سے مختص ہیں اور علمِ اشارہ صرف صوفیہ کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ علم صوفیہ کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ علم شریعت حاصل کر لیتے ہیں۔ باطنی علم کو علمِ اشارہ اس لیے کہا جاتا ہے۔ کیونکہ مشاہداتِ قلب اور مکاشفاتِ اسرار کی تعبیر ممکن نہیں۔ ان کو جاننے کا ذریعہ صرف ذوق و مواجید ہیں اور یہ علم صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو ان احوال و مقامات سے گزرتا ہے[1] لہٰذا متاخرین صوفیہ نے اپنے نظریات اور تجربات و واردات کی تعبیر کے لیے مخصوص زبان اور مخصوص اصطلاحات وضع کیں تاکہ اپنے نظریات کو اپنے ہم مسلک لوگوں کے سوا باقی سب سے پوشیدہ رکھ سکیں۔ لیکن اُن کی نظر میں دوسرے لوگ اس کے اہل نہیں کہ تصوف کے اسرار اُن پر کھولے جائیں۔ اور بقول امام غزالی تصوّف کے اسرار و رموز کو تحریر میں لانا جائز نہیں بلکہ عارفین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سرِ ربوبیت کا افشاء کفر ہے[2]

اہلِ استقامت اصحابِ تصوّف نے بھی اپنے نکات کی تفہیم کے لیے جابجا غریب، مبہم، متشابہ اور ذو معنی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جنید بغدادی پہلے شخص ہیں جنہوں نے تصوّف کے معانی وضع کیے

۱۔ التعرف مذہب اہل التصوّف ص ۶۸

۲۔ احیا علوم الدین ۳ : ۲۴۶

اور ان کو تحریر میں لاتے تھے[۱] انہوں نے خود قرآن الفاظ اور اصطلاحات کا صحیح مفہوم اخذ کیا لیکن اہلِ زیغ نے اپنے باطل عجمی نظریات کے اظہار اور اشاعت کے لیے ان کو من مانے معنی پہنائے۔ ابن قیمؒ نے "منازل السائرین" کی شرح کرتے ہوئے بار بار شیخ ابو اسماعیل ہروی کی گنجلک اصطلاحات کا شکوہ کیا ہے۔ کیونکہ ان کے شارحین نے ان سے غلط مفاہیم اخذ کیے ہیں[۲]۔ اسی طرح ابن تیمیہؒ نے بھی اپنی تصنیفات میں شیخ عبداللہ ہروی کے نظریہ توحید کا ذکر کرتے ہوئے ان کی گنجلک اصطلاحات کا ذکر کیا ہے، جن کی آڑ لے کر اہلِ زیغ نے توحید کے من مانے معانی بیان کیے ہیں[۳] اور ان کی توحید کے ڈانڈے نظریۂ وحدۃ الوجود سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح ابوالقاسم القشیریؒ نے فنا کے جو تین مدارج بیان کیے ہیں[۴]۔ اس سے وحدۃ الوجود کے حامی اپنے نظریات کی تائید حاصل کرتے ہیں۔

توحید جیسا اہم موضوع جسے قرآن میں سب سے زیادہ ذکر کیا گیا ہے بلکہ قرآن کے تمام موضوع توحید ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ قرآن مجید میں بغیر کسی رموز و اشارہ یا تعقید لفظی و معنوی کے صاف صاف بیان ہوا ہے۔ جس میں کسی اشتباہ اور کسی دوسرے معنی کی گنجائش نہیں لیکن یہی موضوع اصحابِ تصوف کے ہاں ان کے رموز و اشارات اور تعقید کی بنا پر گنجلک بن کر رہ گیا ہے، جو چاہتا ہے اس سے اپنا من مانا مفہوم اخذ کر کے اسے "خواص کی توحید" قرار دے دیتا ہے۔

اہلِ تصوف یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح قرآن و حدیث کے ظاہری معنی ہوتے ہیں جو قرآن کے الفاظ و کلمات، ان کی دلالت، ان کی عبارت، ان کی اشارت اور ان کے فحویٰ سے سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کے باطنی معنی بھی ہوتے ہیں، جن کا علم صرف چند صحابۂ خواص کو تھا۔ یہ معانی سینہ بسینہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اہلِ حقیقت تک منتقل ہوئے ہیں اور ان باطنی معانی کے وارث

---

۱ التصوف الاسلامی ص ۱۷، تاریخ ادبیاتِ ایران ص ۲۹۸

۲ مدارج السالکین ۳: ۱۳۸، ۳: ۱۵۱، ۳: ۴۸۶ وغیرہ

۳ منہاج السنۃ النبویۃ ۳: ۸۶

۴ الرسالۃ القشیریہ ص ۴۰

صرف اہلِ حقیقت ہیں اور اہلِ شریعت ان معانی سے محروم ہیں۔ کچھ لوگ علمِ باطن حضرت علیؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ خود حضرت علیؓ کے زمانے میں بھی اس نظریے کی اشاعت کرتے رہے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف منسوب اس غلط بات کی پر زور تردید کی جیسے تمام محدثین نے اپنی اپنی تصانیف میں نقل کیا ہے[1]۔ نیز صوفیہ حضرات اپنے اس موقف کی تائید میں ایک دو احادیث بھی پیش کرتے ہیں اور ان کی من مانی تفسیر بیان کرتے ہیں[2]۔

صوفیہ حضرات یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اہلِ حقیقت یا اصحابِ حال اور اہلِ شریعت یا اصحابِ قال کے معیاراتِ علم ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اہلِ شریعت کے پاس محض چھلکے ہیں اور دین کے اصل وارث تو صرف "اہلِ حقیقت" ہیں۔ کبھی یہ حضرات علماء کو "اہلِ رسوم" اور "اہلِ ظواہر" کا نام بھی دیتے ہیں۔ نیز ان گروہوں کے معیارات میں اس قدر بُعد ہے کہ وہ ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ یہ باطنیہ کے نظریات کی صدائے بازگشت ہے۔ علماء کے علاوہ صوفیائے اہلِ حق نے بھی باطنیہ کے اس باطنی نظریے کی بڑے زور شور سے تردید کی ہے، جیسے صوفیائے اہلِ حق کی تصنیفات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

قرآنِ مجید اور سنتِ نبوی کے مطالعے کے دوران معلوم ہوتا ہے کہ توحید اور تزکیۂ نفس انبیائے کرام کی بعثت کا اصل مقصد ہے۔ اگر اسلام سے توحید اور تزکیۂ نفس کو خارج کر دیں تو کچھ باقی نہیں رہتا۔ ایمان بالرسالت، ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالملائکہ وغیرہ بھی توحید اور تزکیۂ نفس کی بنیاد مضبوط کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ توحید اور تزکیۂ نفس جیسے اہم اُمور کا علم رموز و اشارات کے دبیز پردوں میں چھپا دیا گیا ہو، جیسے صرف حضرت علیؓ اور ایک دو صحابہؓ نے ہی سمجھا ہو، باقی لاکھوں صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض سے محروم رہے ہوں۔ اور ان کی توحید بس عوام کی توحید ہو۔ نیز یہ حضرات یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ علم سینہ بسینہ حضرت علیؓ سے آگے منتقل ہوا۔

قرآن مجید شہادت دیتا ہے کہ انبیائے کرام نے عام طور پر اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱؎ مسند الامام احمد حدیث نمبر ۵۹۹، ۶۱۵، ۷۸۲، ۷۹۸، ۵۸۰، وغیرہ۔

۲؎ التعرف لمذہب اہل التصوف ص ۸۷

نے خاص طور پر توحید اور تزکیۂ نفس کے حقائق کی تفہیم میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور نہ اُن کی تفہیم کے لیے ایسی اصطلاحات وضع کیں جو صحابہؓ کے لیے اجنبی ہوں۔ نہ تعقید و رمز کو اپنے اسلوب کے قریب پھٹکنے دیا۔ سیدھے سادے سے الفاظ تھے جو قلب و ذہن کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اگر مضمون قدرے مشکل اور پیچیدہ ہوتا تو آپؐ اُس کی تفہیم کے لیے تمثیل بیان کر دیا کرتے تھے۔ اسی طرح یہ مضمون اپنے تمام حقائق سمیت صحابہ کرام کے ذہن نشین ہو جاتا۔ اہم بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے کئی بار دہراتے۔ کبھی کبھی کسی بات کے مضمون کی اہمیت پر متنبہ کرنے، اس بات کو استفہامیہ پیرائے سے شروع کرتے اور پھر خود ہی اس کا جواب عطا کرتے۔ اس طرح بات کا مفہوم اپنی پوری گہرائی کے ساتھ سامع کے ذہن نشین ہو جاتا۔ پھر آپؐ اس امر کا بھی خیال رکھتے کہ توحید و تزکیۂ نفس کا اثر اپنے تمام تر تقاضوں کے ساتھ صحابہ کرام کے اعمال و احوال میں ظاہر ہو۔ آپ نے کبھی ایسے نام نہاد باطنی معانی اور اسرار و رموز بیان نہیں فرمائے جن کو صرف چند صحابہ سمجھ سکتے ہوں۔ جن حضرات کو کلامِ نبوت سے ممارست ہے وہ جانتے ہیں کہ آپؐ کا اسلوب کس قدر سادہ اور آسان فہم ہے اس لیے صحابہ کرامؓ کو توحید، حقیقتِ توحید اور حقیقتِ تزکیہ کی کامل معرفت حاصل تھی اور وہ ان کے تقاضوں سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔

توحید اور تزکیۂ نفس ہر انسان کی نجات کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ ان کو سمجھے اور اُن کے تقاضوں پہ عمل پیرا ہوئے بغیر کوئی شخص نجات نہیں پا سکتا۔ لیکن صوفیہ کی اصطلاحات اور وضعیات نے اُسے اجمال اور اشکال سے لبریز اور ناقابلِ فہم بنا کر رکھ دیا ہے۔ حقیقتِ توحید کے فہم کے لیے یہ لازمی چیز ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظِ طیبہ اور اسلوبِ خاص سے رُوگردانی نہ کریں۔ اور تزکیۂ نفس کے حصول کے لیے آپ کے طریقِ کار کی طرف رجوع کریں۔ کیونکہ بقولِ ابن قیمؒ نبوت کی پاک اور معصوم زبان سے نکلے ہوئے الفاظ غلطی اور خطا سے مبرا ہوتے ہیں۔ یہ مبارک الفاظ تفہیمِ مضمون میں ایک خاص تاثیر رکھتے ہیں[1]۔ جو الہامی کلام کا ایک اہم خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مخالفین میں سے میدان بلاغت کے بڑے

---

[1] مدارج السالکین ۳ : ۹۹

بڑے شاہسوار بھی ان الفاظ کی تاثیر کے خوف سے کانوں میں روئی ٹھونسے رکھتے تھے۔

ہمیں قرآنِ مجید کی آیات میں پنہاں اشارات سے انکار نہیں، مگر ان اشارات کی طرف رہنمائی خود قرآن کے الفاظ، اُن کے سیاق وسباق اور اُن کے نظم ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ مجرد ذوق و مواجید اور کشف و مشاہدہ کو قرآن کے ایسے باطنی معانی پر دلیل نہیں بنایا جاسکتا، جن کی تائید قرآن کے ظاہری الفاظ اور اُن کا سیاق وسباق نہ کریں۔

قرآن وسنّت کے صحیح اشارات اور اسرار و رموز کی دو مثالیں پیشِ خدمت ہیں جو قرآن مجید کے صحیح فہم اور اس کے الفاظ و معانی میں تدبّر و تفکّر کا نتیجہ ہیں۔ ابن قیمؒ رقمطراز ہیں:[۱]

"میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ قدس اللہ روحہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک (لاتدخل الملٰئکۃ بیتاً فیہ کلب و صورۃ)

(فرشتے اُس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس گھر میں کتّا یا تصویر ہو) ــــــ کے ضمن میں یہ فرماتے ہوئے سنا ہے[۲] "جب مخلوق فرشتوں کو کسی گھر میں داخل ہونے سے کتّا اور تصویر روک دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی معرفت، اُس کی محبت، اُس کے ذکر کی حلاوت اور اُس کے قرب کا انس اس دل میں کیونکر داخل ہوسکتے ہیں۔ جو شہوات کی تصویروں اور خواہشات کے کتّوں سے بھرا ہوا ہو"۔ ــــــ یہ لفظ کا صحیح اشارہ ہے۔ اشارے کی دوسری مثال یہ ہے کہ طہارتِ لباس اور طہارتِ بدن صحتِ نماز کے لیے ضروری شرط ہے۔ اگر یہ شرط پوری نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی۔ لیکن اگر دل ہی نجس ہو اور اُس شخص نے کبھی اپنے دل کو پاک نہ کیا ہو تو اس کی نماز کو کیونکہ صحیح شمار کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ ایسی نماز نے صرف قضا تو ساقط کر دی ہے۔ کیا ظاہری طہارت صرف باطنی طہارت کی تکمیل کی خاطر نہیں ہوتی؟"

[۱] مدارج السالکین ۲ : ۴۱۸

[۲] ملا علی قاریؒ نے اس قول کو حجۃ الاسلام امام غزالی کی طرف منسوب کیا ہے۔ ملاحظہ ہو شرح الفقہ الاکبر ص ۱۵۰

یہ اشارات الفاظِ قرآن کے حقیقی معانی پر دلالت کرتے ہیں اور الفاظِ قرآن پر غور و تدبر سے حاصل ہوتے ہیں اور ان کے حصول کے لیے اخلاص، ظاہری و باطنی صفائی، صحتِ بصیرت اور حسنِ تدبر لازمی شرائط ہیں۔

اطاعتِ شیخ صوفیہ کے نزدیک تزکیۂ نفس کوئی کتابی علم نہیں جو مجرد کتابوں کے مطالعے سے حاصل کیا جا سکتا ہو، جس طرح دیگر علوم سیکھنے کے لیے کسی کامل استاد کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور جس طرح جسمانی بیماریوں کے علاج سیکھنے کے لیے کسی طبیب حاذق کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا پڑتا ہے اور اس کے زیرِ نگرانی عملی تجربات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح تزکیۂ نفس اور روحانی امراض کے علاج کے لیے کسی مرشدِ کامل کی صحبت میں رہنا پڑتا ہے، لہٰذا مُرید کو حصولِ تزکیہ اور مقاماتِ ہدایت و مکاشفہ اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی شیخ کی بیعت کر کے اس کے طریقے سے التزام کرنا پڑتا ہے۔

اصحابِ تصوف "طریق" یا "طریقہ" کا اطلاق رسوم و قواعد کے اس مجموعے پر کرتے ہیں، جس کا التزام شیوخ طریقہ اپنے مُریدین کی تہذیب اور تربیت کے لیے لازم قرار دے دیتے ہیں[1] جب مُرید شیخ کی بیعت کرنے کے بعد اس کے طریقے میں داخل ہو جاتا ہے تو اس پر اس طریقہ کی پابندی لازم ہو جاتی ہے۔ شیخ اسے اپنی زیرِ نگرانی سلوک کی منزلیں طے کرواتا ہے۔ شیخ مرید کی فطرت، قوت و استعداد اور اس میں مادۂ قبولیت کے مطابق اس کے لیے اوراد و وظائف اور مختلف ریاضتیں تجویز کرتا ہے۔ جب کوئی طالب علم کسی "طریقے" کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے تو اس کا شیخ اس کو حُبِّ مال، حُبِّ جاہ، تقلید اور معصیت سے اجتناب کی تلقین کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام حجابات ہیں۔ مُرید جن کو زہدِ کامل، ترکِ تقلید و تعصب اور توبہ و ندامت سے رفع کرتا ہے۔ مُرید قلتِ اختلاط، قلتِ کلام، قلتِ طعام اور قلتِ تمنا کو لازم پکڑتا ہے۔ وہ ذکر اور ریاضت کے ذریعے اُن تمام شیطانی وسوسوں کا مقابلہ کرتا ہے جو اُسے راہِ سلوک سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب مُرید کے قلب کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہو جاتی ہے تو اس کا قلب اللہ تعالیٰ

---

[1] التصوف الاسلامی ص ۳۳

کے جلال سے منور ہو جاتا ہے۔[1]

صوفیہ کے نزدیک راہِ سلوک میں کوئی شخص محض کتابی علم کے بل بوتے پر راہ نمائی نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ شریعت کا کتنا بڑا عالم کیوں نہ ہو۔ کیونکہ بقول غزالیؒ علما خواہشاتِ نفس کی طرف مائل اور منہاجِ طریق سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں۔[2] لہٰذا راہ نمائی کا کام ایک شیخِ کامل ہی کر سکتا ہے۔ اور شیخِ کامل وہ ہے جو خود کسی شیخِ کامل کے ہاتھ پر بیعت کر کے سلوک کی منزلیں طے کرتا ہوا معرفت و مکاشفہ کی منزل تک پہنچا ہو۔ جس طرح علمائے شریعت اپنے علومِ شریعت یا علومِ ظاہری اور اُن کی نصوص کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں۔ اِسی طرح اربابِ طریق اپنے علومِ طریقت یا علومِ باطنی کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے ہیں۔ مُرید کا ہاتھ اپنے شیوخ کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

تمام اصحابِ طریقت اِس امر پر متفق ہیں کہ وصولِ منزل کے لیے یہ شرط لازم ہے کہ مرید ظاہراً اور باطناً اپنے شیخ کی مخالفت نہ کرے۔ اور اپنے معاملے کو کُلی طور پر شیخ کے سپرد کر دے۔ امام غزالیؒ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ شیخ کے دامن کو اس طرح پکڑ لے جس طرح ایک اندھا نہر کے کنارے چلتے ہوئے اپنے راہ نما کا ہاتھ پکڑ کر چلتا ہے اور اپنا تمام معاملہ اس راہ نما کو تفویض کر دیتا ہے۔ مُرید کو جان لینا چاہیے کہ اس کے لیے اس کے شیخ کی خطا اس کے اپنے صواب سے زیادہ فائدہ مند ہے۔[3]

اصحابِ تصوف شیخ کی غیر مشروط اطاعت پر قصۂ موسٰی و خضر علیہما السلام سے استدلال کرتے ہیں۔[4] لیکن قطعِ نظر اس کے کہ حضرتِ خضر نبی تھے یا کارکنانِ قضا و قدر میں سے کوئی کارکن۔ قرآن تصریح کرتا ہے کہ اُن کا علم وحی پر مبنی تھا، اس لیے وہ علمِ یقینی تھا۔ لیکن غیر نبی خواہ کتنے ہی بڑے مرتبے پر فائز کیوں نہ ہو اس کا الہام بہر حال ظنی ہوتا ہے اور اُس کی صحت کو جانچنے کے

---

[1] احیاء علوم الدین ۳ : ۷۴، تا ۷۵

[2] ایضاً ۳ : ۵۵ [3] ایضاً ۳ : ۷۶

[4] الرسالۃ القشیریۃ ص ۱۴۴

لیے وحی کی میزان پر تولنا پڑتا ہے[1]۔ لہٰذا غیر مشروط اطاعتِ شیخ کے لیے قصہ موسیٰؑ و خضرؑ سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ قرآن و سنت کی نصوص تصریح کرتی ہیں کہ اس طرح کی غیر مشروط اور بے چون و چرا اطاعت صرف نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہے اور اہلِ استقامت اصحابِ طریقت عصمتِ اولیاء کے قائل نہیں[2]۔

شیخِ کامل کی صحبت کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن صوفیہ کے ہاں اطاعتِ شیخ پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ عملاً اس کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت محض ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اصحابِ طریقت کے ہاں اطاعتِ شیخ مبالغے کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ چنانچہ ذوالنون مصریؒ کی طرف یہ قول منسوب ہے[3]۔ طاعۃُ المرید لشیخہٖ فوقَ طاعتہ لربّہ (مرید کی اطاعتِ شیخ اس کی اپنے رب کی اطاعت پر فوقیت رکھتی ہے) سید احمد مجدد الف ثانی خواجہ احرار کا قول نقل فرماتے ہیں[4]

سایۂ رہبر بہ است از ذکرِ حق

حافظ شیرازی کا یہ شعر اربابِ تصوف کے ہاں بہت مقبول ہو کر ایک اصول کی حیثیت اختیار کر گیا ہے ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بوَد ز راہ و رسمِ منزل ہا

یہ مبالغہ ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے چنانچہ بعض اکابر صوفیہ قلب سے ماسوا کے خیال کو دل سے نکالنے کے لیے تصورِ شیخ کو قلب میں بٹھانا ضروری قرار دیتے ہیں۔ تصورِ شیخ یہ ہے کہ

---

[1] مکتوباتِ امام ربانی دفتر اول مکتوب نمبر ۱۰۷

[2] الرسالۃ القشیریۃ ص ۱۷۵ ۔ التعرف لمذہب اہل التصوف ص ۴، کشف المحجوب ص ۲۷۱
مکتوباتِ امام ربانی دفتر اول مکتوب نمبر ۱۰۷

[3] التصوف الاسلامی

[4] مکتوباتِ امام ربانی دفتر اول مکتوب نمبر ۱۰۷

مُرید مال و دولت اور اولاد وغیرہ کی محبت کو دل سے نکال کر اُس کی جگہ اپنے شیخ کے تصوّر کو بٹھا لیتا ہے۔ شیخ مجدد الف ثانیؒ اس مرحلے کو فنائے اوّل اور فنافی الشیخ سے تعبیر کرتے ہیں یہی فنا فی اللہ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

زاں روئی کہ چشم تست احول
معبودِ تو پیر تست اوّل[1]

اور پھر شیخ مرید کے قلب سے تصورِ شیخ کو ختم کر کے آسے منازلِ سلوک کی سیر پر لے چلتا ہے۔ شیخ کی غیر مشروط اطاعت کے آثار ہمیں صحابہ و تابعین کے زمانے میں کہیں نہیں ملتے، جب تصوف نے ایک مستقل ادارے کی حیثیت اختیار کر لی تو اصحابِ تصوف کے طریق میں اطاعتِ شیخ بھی ایک لازمی جزو کی حیثیت سے شامل ہو گئی۔ ہمارے خیال میں فقہ اسلامی میں تقلید کا رجحان بھی تصوف ہی سے آیا ہے۔ (باقی)

---

[1] مکتوباتِ امام ربانی دفتر اوّل مکتوب نمبر ۶۱

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ اُن کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

سید نواب صدیق حسن خاں —— اور خدمتِ حدیث

جناب عبدالرشید عراقی صاحب

(۲)

حضرت والاجاہ کی دینی و علمی مساعی

اب حضرت نواب صاحب کو مکمل سکون نصیب ہوا تو آپ توحید و سنت کی تبلیغ کے لیے ساعی ہوگئے چنانچہ آپ نے علماء کا ایک بورڈ قائم کیا جس میں اُس وقت کے ممتاز علمائے حدیث کو جمع کیا۔ مثلاً مولانا محمد مچھلی شہری[۱] (م ۱۳۳۴ھ) مولانا محمد بشیر سہوانی[۲] (م ۱۳۲۶ھ)، مولانا

---

[۱] مولانا شیخ محمد مچھلی شہری ۱۲۵۲ھ میں پیدا ہوئے۔ علمائے وقت سے تعلیم حاصل کی تکمیلِ تعلیم کے بعد کلکتہ اور اعظم گڑھ میں ملازمت کی۔ مگر زیادہ عرصہ تک ملازمت نہ کر سکے۔ اسی زمانہ میں ۱۲۹۶ھ میں بھوپال کے قاضی القضاۃ مولانا زین العابدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت نواب صاحب موزوں آدمی کے متلاشی تھے کہ اس تردد میں آپ نے حضرت عبداللہ صاحب غزنوی کو خواب میں دیکھا جو ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے تھے کہ ان کو قاضی مقرر کر دو، ان کا نام محمد ہے۔ بیدار ہوئے تو حلیہ اور نام محفوظ تھے۔ اتفاق سے قاضی صاحب بھوپال پہنچے۔ حضرت نواب سے ملاقات ہوئی — دیکھتے ہی فرمایا: بس یہی صورت ہے۔ نام پوچھا تو وہی پایا، جس کی اطلاع خواب میں ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ کو قاضی القضاۃ مقرر کر دیا گیا۔ یہ ۱۵ رجمادی الآخریٰ ۱۲۹۷ھ کا واقعہ ہے۔ ۱۳۳۴ھ میں بھوپال ہی میں انتقال کیا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ۲۵ کے قریب ہے، جو سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔

(تراجم علمائے حدیث ص ۳۷۸ - تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص ۱۴۴)

[۲] مولانا محمد بشیر سہوانی (م ۱۳۲۶ھ)۔ ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد حکیم محمد بدرالدین سے

بشیر الدین محدث[1] (م ۱۲۷۳ھ) اور مولانا سلامت جے راج پوری[2] (۱۳۲۲ھ) وغیرہ۔

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

حاصل کی۔ بعد میں مولانا سید امیر حسن محدث سہوانی (م ۱۲۹۱ھ) اور علمائے فرنگی محل سے تعلیم حاصل کی۔ فقہ حدیث کی تکمیل حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) سے کی۔ سند و اجازہ حدیث شیخ حسین بن عرب (یمنی) (م ۱۳۲۷ھ) سے بھی حاصل ہوا۔

۱۳۱۲ھ میں آپ کا مرزا قادیانی سے مشہور تحریری مناظرہ ہوا۔ جس میں آپ نے مرزا قادیانی کے دلائل کا قلع قمع کیا۔ اور یہ تحریری مناظرہ "الحق الصریح فی اثبات حیاۃ المسیح" کے نام سے طبع ہوا۔

۲۹ جمادی الاولی ۱۳۲۶ھ میں بہ مقام دہلی انتقال فرمایا۔ (تراجم علمائے حدیث ہند ص ۲۵۰)

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] مولانا بشیر الدین محدث قنوجی (م ۱۲۷۳ھ)

۱۲۳۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا عبدالحق سے حاصل کی۔ اس کے بعد شاہ عبدالجلیل شہید (م ۱۲۷۳ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مزید تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی کا رخ کیا۔ اور شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۵ھ) کے ہم سبق ہو کر حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی (م ۱۲۶۲ھ) سے حدیث کی تکمیل کی۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد کچھ مدت آگرہ میں رہے۔ بعد ہ قنوج چلے گئے۔ بعد میں حضرت سید نواب خاں نے آپ کو بھوپال بلالیا۔ (تراجم علمائے حدیث ہند ص ۳۲۹)

[2] مولانا سلامت اللہ جے راج پوری (م ۱۳۲۲ھ)

مولانا سلامت اللہ جے راج پور میں پیدا ہوئے۔ ۲ سال کے تھے کہ سایہ پدری سے محروم ہو گئے۔ ۱۰، ۱۱ سال کی عمر میں جون پور پہنچے اور تعلیم کی ابتدا کی۔ کتب درسیہ کا ابتدائی حصہ مولانا محمد یوسف فرنگی محلی سے پڑھا۔ اس کے بعد مولانا احمد علی محدث سہارن پوری محشی صحیح البخاری (م ۱۲۹۸ھ) اور مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) کے حلقہ درس میں شامل ہو کر حدیث کی تکمیل کی۔ اور بعد میں شیخ حسین عرب یمنی (م ۱۳۲۷ھ) سے سند و اجازہ حاصل کی۔ اشاعت و تبلیغ کا کام کیا اور بڑا مرتبہ پایا۔ (تراجم علمائے حدیث ہند ص ۳۸۷)

علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں:

"بھوپال ایک زمانہ تک علمائے حدیث کا مرکز رہا، قنوج، سہوان اور اعظم گڈھ کے بہت سے نامور اہل علم اس ادارہ میں کام کر رہے تھے۔ شیخ حسین عرب یمنی ان سب کے سرخیل تھے"[1]

اشاعتِ حدیث اور حفظ حدیث کا اہتمام حضرت نواب صاحب نے قرآن پاک کے حفظ کی طرح حفظِ حدیث کا بھی اہتمام فرمایا۔ اور اس پر ماہانہ مشاہرہ مقرر فرمایا۔ چنانچہ مولوی حکیم عبدالوہاب نابینا دہلوی (م ۱۳۲۸ھ) اور مولانا عبدالتواب غزنویؒ نے اس سعادت میں حصہ لیا۔

اشاعتِ کتبِ حدیث و تفسیر میں حضرت نواب صاحب کا کارنامہ بے مثال ہے۔ آپ نے لاکھوں روپے خرچ کر کے بلادِ عرب سے کتابیں منگوائیں اور علمائے کرام میں مفت تقسیم کیں اور اس کے ساتھ فتح الباری شرح صحیح البخاری، تفسیر ابن کثیر، نیل الاوطار یہ کتابیں بلادِ عرب سے منگوا کر اور ہندوستان میں طبع کرا کر علمائے کرام اور کتب خانوں کے لیے مفت تقسیم کیں۔

فتح الباری ہندوستان میں حضرت نواب صاحب کے ذریعہ پہنچی۔ اس سے پہلے صرف فتح الباری کا نام علمائے کرام کو یاد تھا۔ کتاب کی شکل سے محروم تھے۔

حضرت نواب صاحب نے ذاتی کتب خانہ میں بہت سے قیمتی نوادرات جمع کیے[2] اور یہ کتب خانہ نواب صاحب مرحوم نے اپنے آخری عہدِ حیات میں اپنے ورثاء میں تقسیم کر دیا تھا، آپ کے چھوٹے صاحبزادے نواب علی حسن خانؒ نے اپنا ترکہ (کتب) ندوۃ العلماء لکھنؤ کو وقف کر دیا۔

تصانیف حضرت نواب صاحب نے عربی، اردو، فارسی میں ۲۲۲ کتابیں تصنیف کی تھیں

---

[1] تراجم علمائے حدیث ہند ص ۳۶

[2] مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی نے ماہنامہ رفیق لاہور میں ۴ قسطوں میں ان کی فہرست شائع کی تھی۔ (عراق)

جو تفسیر، حدیث، عقاید، فقہ، ردِّ تقلید، سیاست، تاریخ و سیر، مناقب، علومِ ادب، اخلاق، ردِّ شیعیت اور تصوّف کے مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔

آپ کی تصانیف پر علمائے عرب و عجم نے تقاریظ لکھیں، جن کو سلیم فارس آفندی بن احمد فارس مدیر "الجوائب" نے جمع کر کے "قرۃ الاعیان و مسرۃ الاذہان" کے نام سے شائع کیا۔
(مآثر صدیقی - جلد ۲ ص ۱۳۶)

وفات | ۳۰ جمادی الثانی ۱۳۰۷ھ کو آپ کا انتقال ہوا - اور یکم رجب ۱۳۰۷ھ کو اپنے خاص قبرستان میں مدفون ہوئے۔ (تراجم علمائے حدیث ہند ص ۲۹۷)

اولاد و احفاد | دو صاحبزادگان گرامی جناب نواب سید نور الحسن اور سید علی حسن خاں، دونوں آسمانِ علم کے آفتاب و ماہتاب تھے۔

صمصام الملک رضی الدولہ نواب سید نور الحسن خاں حضرت نواب صاحب کے فرزند اکبر تھے۔ تکمیل تعلیم بھوپال میں ہوئی - نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد ۱۹۰۱ء میں بھوپال سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے۔ اور لال باغ لکھنؤ میں ایک کوٹھی خرید کر اور اس میں توسیع کر کے سکونت اختیار کر لی - مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ "یہ کوٹھی عرصہ تک اہلِ علم و اہلِ کمال کی فرودگاہ رہی" (حیات عبدالحی ص ۲۰۳)

نواب علی حسن خاں ؒ - صفی الدولہ حسام الملک شمس العلماء نواب سید محمد علی حسن خاں حضرت والا جاہ امیر الملک نواب صدیق حسن خاں کے فرزند اصغر تھے۔ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء کو بھوپال میں ولادت ہوئی - ۵ سال کے تھے کہ مکتب میں بٹھا دیے گئے۔ آپ نے بھوپال کے نامی گرامی اساتذہ سے فارسی اور عربی زبان و ادب اور علومِ دینیہ کی تحصیل کی - مولانا ابوالیحییٰ امام خاں نوشہروی نے تراجم علمائے حدیث ہند میں آپ کے تمام اساتذہ کی فہرست دی ہے - (ص ۳۱۶ — ۳۱۷)

نوجوانی ہی میں اپنے برادر اکبر مولانا سید نور الحسن خاں کی طرح حضرت مولانا فضل الرحمان گنج مراد آبادی (م ۱۳۱۳ھ) سے بیعت ہو گئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد ریاست میں معزز تعلیمی عہدوں پر سرفراز رہے اور نواب شاہ جہاں صاحبہ کے انتقال کے بعد ۱۹۰۱ء میں اپنے بھائی نواب نور الحسن خاں کے ساتھ لکھنؤ آکر آباد ہو گئے۔ اور ساتھ ہی علمی و ملّی خدمات میں مشغول ہو گئے۔

بحث و نظر

ایک فراموش شدہ سنّت

جناب محمد امین صاحب ۔ ریاض

مولانا سیّد محمود حسن (جامع العلوم ملتان) کا مضمون عنوان بالا سے شائع ہو چکا ہے جس کے مطابق اُن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سر ڈھانپنا از روئے سنت ضروری ہے ۔ ریاض (سعودی عرب) سے محمد امین صاحب نے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے ۔ مناسب یہی معلوم ہوا کہ اختلافی نقطۂ نظر بھی ان اوراق میں پیش کر دیا جائے ۔ (ادارہ)

ربیع الاوّل کے ترجمان القرآن میں مولانا سیّد محمود حسن صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کل ننگے سر رہنے کا جو رواج عام چل پڑا ہے وہ سنّتِ نبوی اور اسلامی تہذیب کے خلاف ہے ۔ اس سلسلے میں کچھ اصولی گزارشات مختصر طور پر ہم پیش کرنا چاہتے ہیں :۔

۱ ــــ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط اطاعت ہم پر بحکم الٰہی فرض ہے اور ایک مومن اس وقت تک مومن ہو نہیں سکتا جب تک کہ حضورؐ کا اتباع برضا و رغبت نہ کرے ۔ لہٰذا حضورؐ کے اسوہ کی پیروی ہی میں ہمارے لیے دین و دُنیا کی سعادت ہے اور ہمارا یہ کام نہیں کہ ہم حضورؐ کی سنّت کی پیروی کرنے میں "رخصتیں" تلاش کریں بلکہ حضورؐ کے ساتھ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ والہانہ جذبے کے ساتھ اور مخالفتوں کا سامنا کر کے حضورؐ کے احکام کا اتباع کریں ۔

۲ ــــ لیکن اس کے باوجود یہ ایک معروف قانونی حقیقت ہے کہ شریعت کے احکام کی (خواہ وہ نصوص قرآن پر مبنی ہوں یا سنّتِ رسول پر) تشریعی حیثیت یکساں نہیں ہے ۔ کسی چیز کو شریعت نے فرض اور واجب قرار دیا ہے (کہ اس کا تارک گنہ گار ہوگا) تو کسی کو مندوب اور مستحب سمجھا ہے

(کہ اس کے کرنے میں ثواب ہے نہ کرنے میں مواخذہ نہیں) اور کسی میں صرف اباحت ہے کہ یہ کام کیا جا سکتا ہے اور اس کا کرنا نہ کرنا شریعت کی نظر میں برابر ہے۔ دوسرے لفظوں میں نہ اس کا کرنا ضروری ہے اور نہ اسے چھوڑ دینا عیب۔

۳ ـــ اسلامی شریعت دین اور دنیا میں تفریق نہیں کرتی بلکہ بیک وقت دونوں کی فلاح کے لیے نقشۂ کار مسلمانوں کو مہیا کرتی ہے لیکن احکام میں خود قرآن و سنّت کا اسلوب یہ ہے کہ جن امور میں مسائل کا ادراک اور اس کی تفصیلات کا تعین عقل نہیں کر سکتی ہے، انہیں پوری تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے یا اس کی وضاحت حضورؐ نے فرما دی ہے (یعنی اعتقادات و عبادات وغیرہ)۔ لیکن جن اُمور کا تعلق تمدنی ضرورتوں اور انسانوں کے آپس کے معاملات سے ہے۔ اس بارے میں شریعت نے چند بنیادی قاعدے اُمت کو عطا کر دیے ہیں اور ضروری باتیں بتا دی ہیں اور اس کے بعد آزادی دے دی ہے کہ وہ ان اصول و قواعد کی روشنی میں تفصیلات طے کرتی رہے۔ مثال کے طور پر ہم اپنے دیہی معاشرے کی مثال دیتے ہیں کہ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ اب کھیتی باڑی کرنے میں شریعت کے عام احکام تو لاگو ہوں گے کہ ایک آدمی دوسرے کا مال بلا حق نہ کھائے، ہمسائے کی ایذا رسانی نہ کرے، پیداوار میں سے عشر اور زکوٰۃ کے اخراج کا بندوبست کرے، اس پیداوار کی خرید و فروخت میں احکام شریعت کا پابند رہے۔ اس پیداوار کے حصول کے لیے اگر ملازم رکھے تو اُن کے جائز حقوق ان کو دے .... وغیرہ۔ ان سب اُمور میں شریعت نے اس کے لیے احکام رکھے ہیں لیکن اس سے آگے بڑھ کر شریعت اس کو یہ نہیں بتائے گی کہ وہ ہل کیسے چلائے؟ سیدھے بیل کا پرانا دیسی ہل مفید ہے یا انگریزی ہل؟ یا ان دونوں کو چھوڑ کر ٹریکٹر بہتر رہے گا؟ یا یہ کہ ٹریکٹر سے ہل چلانا "بدعت" ہے اور یا چونکہ اس میں فائدے ہیں اس لیے یہ "واجب ہے" اور پرانا دیسی ہل چلانا "حرام" اور "مکروہ" ہے۔

۴ ـــ بالکل اسی طرح کا مسئلہ لباس کا بھی ہے، یہاں شریعت کو مطلوب یہ ہے کہ آدمی اپنا ستر ڈھانپے، اُس کا لباس ایسا ہو کہ اُسے موسموں کی شدت سے محفوظ رکھے، اُس کی مالی حالت کے مطابق ہو اور اُس کے انسانی شرف و وقار کے مناسب ہو۔ لیکن اس سے آگے بڑھ کر شریعت ہم کو یہ نہیں بتائے گی کہ ہم تہبند پہنیں یا شلوار اور پاجامہ بہتر ہے یا پتلون، اور سر کو ڈھانپیں یا ننگا رکھیں

اور یا پھر سر پہ ٹوپی رکھیں یا عمامہ، اور اسی طرح قمیص پہنیں یا بش شرٹ اور بازو کھلے ہوں یا بند۔ ان چیزوں میں شرعی حکم تلاش کرنا عبث ہے۔

۵ ـــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص زمانے میں، ایک مخصوص معاشرے میں رہتے تھے، جہاں کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی لوگوں کی خاص عادات تھیں (اپنی ضروریات اور حالات کے مطابق) اور اپنے مخصوص طریقے تھے۔ اب شریعت کو یہ مقصود نہیں کہ قیامت تک آنے والے لوگ اسی طرز کا لباس پہنیں جو حضورؐ یا آپ کے صحابہ اپنے معاشرے میں پہنتے تھے یا وہ کھانے کھائیں جو وہ کھاتے تھے۔ نہ قرآن نے اس کی تخصیص کی ہے اور نہ حضورؐ نے اس قسم کا حکم کسی کو دیا ہے اور نہ حضورؐ کے متبعین اور ہمارے جلیل القدر اسلاف میں سے کسی نے اس کا یہ مفہوم لیا ہے۔ حضورؐ نے کبھی کسی کو نہیں فرمایا کہ چونکہ مجھے کدو پسند ہے اس لیے تم بھی کدو کھاؤ یا میں تہبند اور عمامہ پہنتا ہوں اس لیے تم بھی تہبند اور عمامہ باندھو وغیرہ۔

۶ ـــ یہی وجہ ہے کہ اصولیوں نے افعال الرسول کی تشریعی حیثیت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اس امر کا خیال رکھا ہے اور اکثر اصولیوں کی یہی رائے ہے[۱] کہ اگر حضورؐ نے کوئی فعل کیا ہو لیکن اس کے کرنے کا حکم نہ دیا ہو اور یہ کام قربت یعنی عبادات وغیرہ کی نوعیت کا بھی نہ ہو تو امت پر اس کا اتباع "واجب" نہیں ہوتا بلکہ اس سے صرف اس کام کی "اباحت" ظاہر ہوتی ہے کہ ایسا کیا جاسکتا ہے اور ایسا کرنا حرام اور مکروہ نہیں ہے۔ اس میں اگر کوئی شدت برتے تو زیادہ سے زیادہ اس میں سے ندب کا پہلو نکل سکتا ہے کہ چونکہ حضورؐ نے یہ کام اس طرح کیا ہے لہٰذا ہم بھی اسی طرح کریں۔ لیکن نہ کرنے والا پھر بھی قابلِ مواخذہ نہ ہوگا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک مختار یہی ہے کہ معاشرتی عادات یعنی کھانے پینے اور اوڑھنے بچھونے جیسے کاموں میں افعال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف اباحت

---

[۱] کتاب اللمع فی اصول الفقہ لفیروز آبادی، ص ۴۴، مطبعہ بمصر ۱۳۲۶ھ۔ الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی، جلد ۱ ص ۲۷۴، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۰ھ۔ المستصفیٰ للغزالی، جلد ۲، ص ۲۱۶، مطبع دار الصادر۔ فواتح الرحموت فی شرح مسلم الثبوت، جلد ۱ ص ۱۸۰ علی ہامش طبع دار الصادر۔

ظاہر ہوتی ہے۔

۷۔۔۔ مولانا سید محمود حسن صاحب نے اپنے مضمون میں جتنی بھی احادیث اور روایات نقل کی ہیں، اُن سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ عمامہ باندھا کرتے تھے اور ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضورؐ نے اُمت کو عمامہ باندھنے کی تلقین کی ہے یا سر ڈھانپے رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اب کیا یہ شریعت کے منشا کے مطابق ہے کہ ہم لوگوں سے اس چیز کا مطالبہ کریں جس کا مطالبہ خود حضورؐ نے ہم سے نہیں کیا ہے۔

۸۔۔۔ ہم یہاں مختصر طور پر ان دو عظیم فقہی قاعدوں کا بھی ذکر کرنا چاہتے ہیں جن سے صرفِ نظر کر کے کوئی شرعی حکم (فروع میں) نافذ نہیں کیا جانا چاہیے اور یہ قاعدے ہیں:

ا۔ مقاصد الشریعہ اور ۲۔ عرف

ا۔ مقاصد الشریعۃ

شریعت نے جو بھی قاعدہ مقرر کیا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی "علت" ہے اور مسلمانوں کو اس کا مکلف کرنے میں شریعت کے پیشِ نظر کچھ نہ کچھ اہداف اور مقاصد ہیں اور وہ امور جن کا تعلق انسانوں کے باہمی معاملات سے ہے اور جو تمدنی ترقی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور اس کے لیے شارع نے ہمیں ناقابلِ تغیر نصوص بھی نہیں دیے تو ایسے معاملات میں ماضی کا تعامل یا فیصلے اپنی "شکلی" صورت میں بعد کے زمانے کے لیے حجت نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ایسے معاملات میں شریعت کے عمومی مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شرعی حکم عاید کیا جانا چاہیے۔

۲۔ عرف

یہی کیفیت عرف کی ہے یعنی وہ عادات جو لوگوں میں مروّج ہو گئی ہوں اور شریعت کے اُصولوں کے خلاف بھی نہ ہوں وہ شریعت کے نزدیک بھی معتبر اور قابلِ قبول ہیں۔ اب اگر لوگ اس دائرہ اباحت کے اندر رہتے ہوئے اپنی کسی عادت کو بدل لیتے ہیں تو اُس پر شرعی نقطۂ نظر سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا، چاہے وہ اسلاف کی عادات سے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ خاص طور پر کھانے پینے اور پہننے اوراُوڑھنے کی عادات اس میں شامل ہیں۔ خود ہمارے ہاں ہندو پاک میں بھی ٹوپی شیروانی وقار اور تہذیب کی علامت تھی، بلکہ اب بھی ہے نادر سنجیدہ اور وضعدار لوگ ننگے سر رہنا ناپسند

نہیں کرتے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ اس عرف کو عرف ہی رہنے دیا جائے اور حضورؐ کے عمامہ باندھنے کی بنا پر سر پر ٹوپی رکھنے یا عمامہ باندھنے کو مستقل شرعی حکم نہ بنایا جائے، اور اب اگر لوگوں نے پہلے عرف کو بدل کر ننگے سر رہنے کو اپنا عرف بنالیا ہے تو یہ بھی شرعی لحاظ سے مقبول ہونا چاہیے، مردود نہیں۔ کیوں کہ یہ امور مباحہ میں سے ہے۔ اور اس میں کوئی نص بھی وارد نہیں ہوئی ہے۔

اوپر کی سطور میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک اصولی اور علمی بات ہے اور اس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسے علمی اختلاف پر ہی محمول کیا جانا اور اسے حضورؐ کی سنت سے اعراض برتنے یا سنت کی تشریعی حیثیت اور عظمت سے انکار یا بے ادبی پر محمول نہ کیا جائے۔

قارئین کی زبردست خواہش کے پیش نظر اس شمارے سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ لہٰذا آٹھ صفحات کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ اب ہر شمارہ ۴۸ صفحات کے بجائے ۵۶ صفحات پر مشتمل ہوگا قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا جارہا ہے۔ لیکن خسارہ کا خطرہ موجود ہے۔ اس لیے قارئین سے التماس ہے کہ ترجمان القرآن کی اشاعت کو بڑھانے کی کوشش جاری رکھیں اور خود خریدار مزید ایک خریدار بناکر ادارہ کے ساتھ تعاون فرمائیں۔

شکریہ

رسائل و مسائل

کیا مزارعت ناجائز ہے؟

سوال:- ۱۳ نومبر ۱۹۸۱ء کو ایک روزنامے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس کا عنوان ہے "سود کی مصطفوی تشریح" (مضمون کی اخباری کٹنگ ساتھ ہی لگی ہوئی ہے)۔

اس میں موصوف نے بتایا ہے کہ "اسلام زمین کو بٹائی پر دینے اور مکان کرایے پر چڑھانے کو سود قرار دیتا ہے۔"

جب سے یہ مضمون شائع ہوا ہے۔ ایک اچھی خاصی الجھن پیدا ہو گئی ہے، آپ سے درخواست ہے کہ اس مضمون کا قرآن و سنت اور آئمہ سلف کی آراء کی روشنی میں جائزہ لے کر اس سے پیدا ہونے والی الجھن دور فرمائیے۔

جواب:-

اِن دنوں ایک بڑی مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اخباری کالموں میں اجتہاد خانے کھل گئے ہیں، اور صحافت کو بعض لوگ ایسی کاروباری سطح پہ لے آتے ہیں کہ انہیں ہر معاملے میں "آدمی نے کتے کو کاٹ لیا" جیسے نئی نئی چونکانے والی باتیں درکار ہیں۔ اُن کے لیے دلچسپ ایسا مضمون پیدا نہیں کرتا جس میں زور دیا جائے کہ نماز پڑھنا ضروری ہے، بلکہ جاندار اور جاذبِ توجہ مضمون وہ ہوگا جس میں یہ ثابت کیا گیا ہو کہ مروجہ نماز ایک عجمی سازش کا نتیجہ ہے۔

اس طرح کے اخباری اجتہادات پیش کرنے والے کالم نویسوں کو اس سے زیادہ بڑے کارنامے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ موضوع سے متعلق کوئی مضمون اُٹھائیں اور اس میں سے دو ایک روایات کے حوالے دے دیں۔ عام قاری کے لیے اتنا کچھ بھی خاصا مرعوب کُن ہے۔

آپ کو خود اندازہ ہو گا کہ شکوک یا انتشار پیدا کرنا کتنا آسان ہے۔ ایک بھلے مانس آدمی سامنے سے گزر رہا ہو تو چائے خانے کے باہر بیٹھے ہوئے چند افراد میں سے کسی کا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس شخص نے جو کوٹ پہن رکھا ہے وہ چوری کا ہے۔ پھر اگر لوگ اُس کے پیچھے پڑ جائیں تو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کوٹ میرا اپنا ہے اُسے بہت کچھ کرنا ہو گا۔ ہو سکے تو وہ کاغذات میں سے کپڑا خریدنے کا کیش میمو نکالے، درزی کا بل محفوظ ہو تو اُسے سامنے لائے، محلے کے کسی معزز آدمی سے شہادت دلوائے کہ یہ ایسا گھٹیا آدمی نہیں اور بعض دوستوں کے ذریعے یقین دہانی کرائے کہ یہ کوٹ اسی کا ہے اور دو سال سے اس کے پاس ہے۔

بعینہٖ دینی و شرعی معاملات کی یہی صورت ہے۔ ایک غلط الفکر آدمی اُدھر سے ایک روایت، اِدھر سے فقہ کا ایک حوالہ، تیسری طرف سے کسی نامور شخصیت کا ناتمام اقتباس پیش کر کے بحث چھیڑ دیتا ہے کہ اہلِ شریعت نے فلاں معاملے میں جو مسلک اختیار کر رکھا ہے وہ بے بنیاد ہے بلکہ حقیقت سے متضاد ظاہر ہے کہ کم علم مگر سنجیدہ دل لوگوں کے کان کھڑے ہوں گے اور ہر کوئی سوچنے لگے گا کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ کاروباری صحافت نے ایسے لوگوں کے لیے کھلا میدان مہیا کر دیا ہے کہ وہ ہر روز نئے موضوعات پر زالی بحثیں اٹھائیں اور لوگوں کے ذہنوں کو پراگندہ کریں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ شریعت یا کم سے کم ائمہ و علمائے شریعت پر سے اعتماد اُٹھنے لگے گا اور فضا سیکولرازم کے لیے زیادہ ہموار ہو گی۔ بات بات پر علمی تجزیہ کر کے جامع تسلی بخش جواب اخبارات میں پیش کرنا آسان ہے، نہ کوئی اتنا وقت دے سکتا ہے کہ شوشہ بازیوں کے پیچھے پڑا رہے۔

اجتہادی آرا قائم کرنے کا عمل کچھ ویسا ہے جیسے سپریم کورٹ کے جج اور وکلاء کتابوں کے ڈھیر لگا کر الفاظِ قانون، مطالبِ قانون اور عملی نظائر اور اُن کی تشریحات پر کئی کئی دن غور و بحث کر کے کوئی نکتہ طے کرتے ہیں۔ اگر قانونِ شریعت ایک ایسی کھلی چراگاہ ہے کہ جس میں ہر کوئی گھس سکتا ہے اور ہر طرح کی گڑبڑ کر سکتا ہے۔ جو کچھ چاہے چٹ کر جائے اور جس روئیدگی کو چاہے پامال کر دے۔ عملی نظائر تو کیا عملی سنت سے بھی وہ بے نیاز ہو کر اپنا تعلق سیدھا اللہ میاں سے جوڑ سکتا ہے۔ ساری تاریخ پڑی چیختی رہے اور عدل و فقہ کا نظام مسلسل پامال ہوتا رہے، اسے تو اپنے نظریے سے غرض ہے اور اس کے لیے وہ کسی پسندیدہ روایت کو سہارا بنائے گا۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ شریعت کے بارے میں، وحی الٰہی کے بارے میں اور علی الخصوص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک صاحبِ ایمان کو حد درجہ مؤدب اور محتاط ہونا چاہیے۔ یہ ایسا نظامِ قانون نہیں ہے، جس کو ذہنی کھیل تفریح کا ذریعہ بنایا جائے اور جس کے متعلق نرالے نکتے چھانٹ کر اخباروں کی مارکیٹ بڑھائی جائے۔

معاف کیجیے گا، اتنی تمہید میں نے اس لیے لکھی کہ میرا دل دکھا ہوا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جس طرح ایکٹریسوں کی تصویریں اور طنز و مزاح کے کالم اور کھیلوں کی خبریں اور فلموں کے تذکرے ہوتے ہیں، انہی کے ساتھ کوئی کالم یا کوئی صفحہ مذہبی مباحث کا بھی ہوتا ہے۔ بلکہ ایک ہی جگہ لامذہبیت بھی ہے، مذہب کی مخالفت بھی ہے، مذہب سے بے تعلقی بھی ہے اور مذہب کے مسائل بھی ہیں۔ ہم جس دین کے پیرو ہیں، وہ دوسرے مختلف اور متضاد عناصر کے ساتھ مل کر کوئی مرکب یا مخلوط نہیں بناتا، بلکہ وہ مطالبہ کرتا ہے کہ مجھے مانو تو پوری طرح سے مانو، آدھا تیتر اور آدھا بٹیر والا معاملہ میرے ساتھ نہ کرو۔ ہمارا مذہب (دین) صحافت کی متاعِ کاروبار نہیں ہے۔ جن مالکانِ اخبار کو اس پر مثبت، گہرا اور شعوری ایمان ہو وہ اسے سربلند کرنے میں حصہ لیں اور جن کے کاروباری مفاد اسے اپنے تابع رکھ کر استعمال کرنا چاہتے ہوں، وہ اس کی جان بخشی کر دیں۔

یہ کوئی بات نہیں ہے کہ صاحب! جو بات غلط آتی ہے، آپ اس کا جواب دے سکتے ہیں، ہمارے صفحات کھلے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ غلط اور فضول باتیں آئیں کیوں؟ آپ تحریروں کو چیک کر سکتے ہیں، آپ کسی صاحبِ علم کو موصولہ مضامین کی جانچ پڑتال پر مقرر کر سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر اگر آپ کو غلط اور صحیح سے کوئی مطلب نہ ہو تو ہر غلط بحث کا جواب دینے کے لیے مستند اور باشعور فارغ افراد موجود ہونے چاہئیں کہ جو فائر بریگیڈ کی طرح ہر وقت تیار بیٹھے ہوں۔ جو لوگ کچھ مقام رکھتے ہیں وہ مصروف زندگیاں رکھتے ہیں، اور ان میں سے اگر کوئی لکھے بھی تو غلط رایوں کے جھاڑ جھنکار صاف کرنے کے لیے اعتراض اٹھانے سے دس گنا زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر کالم آدھ کالم لکھ دینے سے کام نہیں چلتا۔ مضمون اگر قسطوں میں چلے تو ایک ایک قسط پر دس نئی بحثیں اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ دین کے متعلق تحقیق و اجتہاد کا کام یا تو محنت سے لکھی ہوئی کتابوں میں ہو سکتا ہے یا ذرا کم درجے میں اعلیٰ علمی رسائل میں۔ ایسی چیزوں کے لیے بڑی سنجیدہ فضا چاہیے،

اخباری فضا اور کاروباری فضا قطعاً موزوں نہیں۔

مگر اب جو کچھ ہو رہا ہے اُسے یکسر نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے اچھا کیا کہ اپنا سوال ارسال کر دیا۔ اس کا جواب ہمارے لٹریچر میں بڑی تفصیل سے موجود ہے۔ اس پر نظر رکھنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔ سو میں یہ خدمت انجام دے رہا ہوں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق بہ سلسلہ مزارعت (یا بٹائی) کی تلخیص یہاں پیش کر رہا ہوں۔ زیادہ تفصیل کے لیے آپ "مسئلہ ملکیتِ زمین" نامی کتاب دیکھیں۔

ہم اس معاملے کو یوں لیتے ہیں کہ ایک مدعی یہ دعویٰ لے کر سامنے آیا ہے کہ اسلام میں مزارعت یا بٹائی قطعاً ممنوع ہے۔ وہ نیل الاوطار اور تفسیر مواہب الرحمٰن سے حوالے دیتا ہے۔

ہم سرسری حوالوں کی بجائے اُن ساری روایات کو سامنے لاتے ہیں جن سے امتناعِ مزارعت کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت رافع بن خدیجؓ کی روایات

حضرت رافع ایک روایت میں اپنے چچا کا نام لیے بغیر اور ایک میں ان کا نام ظہیر بن رافع بتا کر اُن کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ ایک روایت میں وہ خود اپنے کھیتوں پر کام کرتے ہوئے صورتِ مزارعت حضورؐ سے بیان کر کے حضورؐ کا ارشاد سامنے لاتے ہیں۔ جنابِ مجاہد نے بھی رافع بن خدیج ہی کے حوالے سے روایت بیان کی ہے۔ اسی طرح سعید بن مُسیّب اور سلیمان بن یسار بھی روایتِ رافع کے راوی ہیں۔ پھر حضرت رافع کے صاحبزادے اُن کی روایت کو دوہراتے ہیں۔ رافع ہی کی روایت کو حضرت ابنِ عمرؓ اُن کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ اِن مختلف روایات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے ہم کو منع کر دیا کہ ہم زمینوں میں مزارعت کا معاملہ کریں اور تہائی، چوتھائی یا مقررہ مقدارِ غلّہ کے عوض اُن کو کرایہ پر دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ مالکِ زمین یا تو خود کاشت کرے، یا دوسرے کو کاشت کرنے کے لیے دے، یا اپنی زمین کو روک رکھے۔ بٹائی یا کرایہ پر زمین دینے کو آپؐ نے سودی معاملہ قرار دیا ہے۔ آپؐ نے محاقلہ (صورتِ مذکورہ) کے علاوہ مزابنہ (درختوں پر لگی ہوئی کھجور کی بیع) سے منع فرمایا۔

جن چند اصحاب تک یہ روایت پہنچی اُن کا یہ بیان ہے کہ ہم نے زمینوں کو بٹائی پر دینے کا بظاہر

مفید طریقہ خدا ور رسولؐ کی خوشنودی کے لیے ترک کر دیا۔

حضرت جابر بن عبداللہ کی روایات

رافع بن خدیج کے بعد امتناعِ مزارعت کا دوسرا بڑا ماخذ حضرت جابر بن عبداللہ کی روایات ہیں۔ ان میں یہ باتیں کہی گئی ہیں:

۱۔ آنحضرتؐ نے زمین کے کرائے سے منع فرمایا۔

۲۔ آپؐ نے مخابرہ (بٹائی پر کاشت کرانے) سے منع فرمایا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ زمین اجرت پر یا پیداوار کے حصے پر کاشت کے لیے لی جائے۔

۴۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو اسے چاہیے کہ خود کاشت کرے، اور اگر خود نہ کرتا ہو تو اپنے کسی بھائی کو کاشت کے لیے دے دے لیکن اگر وہ نہ دینا چاہے تو پھر اپنی زمین کو روک رکھے۔

۵۔ دوسری روایت میں ہے کہ اسے چاہیے کہ ہبہ کر دے یا عاریۃً دے دے۔"

۶۔ حضورؐ نے زمین کو دو تین یا چند سال کے لیے بیچنے سے منع فرمایا۔

۷۔ حضورؐ نے چند سال کے ثمر کی بیع سے منع فرمایا۔

۸۔ حضرت جابرؓ نے حضورؐ کو مزابنہ اور محاقلہ سے منع فرماتے سنا۔ انہوں نے خود ہی مزابنہ اور محاقلہ کی تشریح بھی کی۔ (جو اوپر بیان ہو چکی ہے)۔

۹۔ حضرت جابر کی ایک روایت میں ہے کہ جو شخص مخابرہ نہ چھوڑے، اس کو اللہ اور رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ واضح رہے کہ یہ وہی الفاظ ہیں جو قرآن میں سود خوری کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

چار دیگر صحابیوں کی تائیدی روایات

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "جس کے پاس زمین ہو وہ یا تو خود کاشت کرے، یا اپنے بھائی کو بلا معاوضہ دے دے، لیکن اگر وہ نہ دینا چاہے تو اپنی زمین کو روک رکھے" دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا۔

حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ حضورؐ نے مزابنہ اور محاقلہ سے منع فرمایا انہوں نے بھی مزابنہ اور محاقلہ کی وضاحت کی ہے۔

ثابت بن ضحاک کہتے ہیں کہ حضورؐ نے مزارعت سے منع فرمایا۔

زید بن ثابت کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ سے منع فرمایا: ثابت بن حجاج نے زید بن ثابت سے پوچھا کہ مخابرہ کے کیا معنی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: اس کا مطلب یہ ہے کہ تم آدھی یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض زمین لے لو۔ (نعیم صدیقی)

(باقی)

مطبوعات

اسوۂ حسنہ مؤلف: محمد شریف قاضی - ناشر: مکّہ بکس - ۵ بخشی اسٹریٹ، بیرون موری دروازہ لاہور - صفحات: ۵۲۸ قیمت ۳۵/- روپے

انسان کی ہدایت اور آخروی کامیابی کا انحصار دو بنیادی باتوں پر ہے۔ ایک خدا کا صحیح تصور اور اس سے صحیح تعلق، دوسرے رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کے دینی و شرعی مقام کا صحیح تصور اور اس کے مطابق صحیح عملی رویّہ!

حضورؐ کو خدا نے اپنے پیغام وحی کو پہنچانے اور پھیلانے کا ذریعہ بنانے کے علاوہ یہ منصب بھی عطا کیا کہ آپؐ اس پیغام کی قولی تشریح کے علاوہ اس کی عملی صورت بھی دنیا کے سامنے پیش کریں، نیز جو لوگ ایمان لائیں اُن کے لیے معلم، مربّی اور مزکّی ہوں، اور قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ و معیار!

حضورؐ نے خدا کے دین کی دعوت دے کر اُسے قبول کرنے والوں پر مشتمل ایک جماعت بنائی، اس جماعت کو تربیت دی، اس کے ذریعے اصلاح تہذیب و ریاست کی ایک تحریک چلائی اور پھر خود ایک ریاست کا نظام چلا کر دکھا دیا کہ خدا تعالیٰ کیسا اجتماعی نظام انسانوں کے لیے پسند کرتا ہے۔

سیرت نگاروں کا کیا ہوا وسیع کام مجموعی طور پر حضورؐ کے پیغام اور منصب اور اسوہ کو اجاگر کرتا ہے۔ مگر سیرت نگاری صرف یہ نہیں کہ واقعات و احوال کو ترتیب سے بیان کر دیا جائے؟ بلکہ حضورؐ کے منصب کا صحیح تصور دلانا بھی حضورؐ کے سیرت نگار کی ذمہ داری ہے۔ امن و عدل کا ایسا شاندار ریکارڈ کوئی دوسری قوم پیدا نہ کر سکی۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ "اسوۂ حسنہ" اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ اس میں واقعات و احوال

کے ساتھ ساتھ دینی احکام اور شرعی کاروائیوں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ بطور خاص ہر بحث میں قرآن سے استدلال کیا گیا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ عیسائیوں نے جس غلو سے کام لیا تھا اور جس کے اثرات مسلمانوں میں بھی پھیلے ہیں، اُس سے یہ کتاب محفوظ ہے۔ اس دَور کا ایک فتنہ نبوت محمدیہ کے بارے میں غلو ہے۔ خدا اس فتنے سے اُمت کو مامون رکھے۔

قاموس الاقبال (۲ جلد) مرتب: جناب پروفیسر عبدالجبار شاکر۔ ایم۔اے ایل۔ایل۔بی

ناشر: بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن۔

اقبال کے متعلق شائع شدہ تمام کتب، خاص نمبروں اور مقالات وغیرہ کی پوری فہرست جناب عبدالجبار شاکر نے مرتب کر کے اہلِ علم و تحقیق پر خصوصاً اور اساتذہ و طلبہ پر عموماً بہت احسان کیا ہے۔ پروفیسر خواجہ غلام صادق کے یہ الفاظ حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ:

"جناب عبدالجبار شاکر صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں اقبالیات پر مشتمل مکمل ترین کتابیات ترتیب دی ہے اور یوں اقبال سکالرز کے لیے تحقیق کے نئے عنوانات کی راہ ہموار کی ہے" (جلد ۲)

"یہ اقبالیات پر جدید ترین اور مفید مجموعۂ کتابیات ہے"۔ (جلد ۱)

قاموس میں بعض ایسی کتب اور رسائل کے مندرجات کی نشاندہی ہے جو عام نگاہوں سے بالکل اوجھل ہیں۔ شاکر صاحب نے متعدد نایاب چیزوں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔

الحسنات۔ نماز نمبر مدیر صابر قرنی - قیمت نماز نمبر ۸ روپے۔ چندہ سالانہ الحسنات ۴۰/- روپے

پتہ: ۱۹/C منصورہ۔ ملتان روڈ۔ لاہور

صابر قرنی صاحب کئی سال سے الحسنات کے ذریعے خواتین، طلبہ، بچوں اور کم خواندہ لوگوں تک

اسلامی تعلیمات پہنچا رہے ہیں۔ نماز نمبر اسلام کی اہم بنیادی عبادت سے متعلق ہے۔ اس نمبر میں مطبوعہ معلومات بھی ہیں اور لطیف نگارشات بھی۔ زبان سادہ اور آسان ہے۔ یہ نمبر ڈائجسٹ سائز پر نکالا گیا ہے۔ نماز کی افادیت کو صحت اور عقل کے نقطۂ نظر سے بھی واضح کیا گیا ہے۔ کلماتِ نماز، مسائلِ نماز، طریقِ ادائیگی اور خشوع و خضوع کے متعلق بہت سی مفید باتیں اس نمبر میں جمع ہیں۔

دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی تحریک نماز کو اس طرح کے خاص نمبروں اور ایسی کتابوں سے تقویت مل سکتی ہے۔

ہمارے فرائض اور ہمارے حقوق | مؤلف: حافظ نذر احمد۔ پرنسپل شبلی کالج لاہور۔ ناشر: اسلامی اکادمی اردو بازار، لاہور و مسلم اکادمی، محمد نگر، لاہور۔ صفحات: ۳۳۶ ۔ خوبصورت جلد۔ قیمت: -/۳۳ روپے

ہر حق سے ایک فرض پیدا ہوتا ہے اور ہر فرض کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی حق ہوتا ہے۔ حقوق و فرائض کے صحیح توازن ہی سے اسلامی زندگی تشکیل پاتی ہے۔ آج ہر طبقہ اور ہر فرد اپنے حقوق کا طلب گار نظر آتا ہے، مگر کسی کو اپنے فرائض کی طرف توجہ نہیں ہے۔ اسلام میں فرائض اولیت رکھتے ہیں۔ یعنی اپنا فرض تو بہر حال آپ کو پورا کرنا ہے، اس کے ساتھ اپنا حق حاصل کرنے کی بھی تگ و دو کیجیے، لیکن اگر حق نہ بھی ملے تو بھی فرض ادا کرنا ضروری ہے۔

پورا اسلام نام ہی حقوق و فرائض کی تعلیم کا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت اس کتاب سے ہوتی ہے مؤلف نے زندگی کے ہر شعبے اور ہر منصب کے متعلق حقوق و فرائض کو کتاب و سنت کے دلائل سے واضح کیا ہے۔ خدا، رسولؐ اور قرآن کے علاوہ علماء، اہل کتاب، سائل، میت، ماں باپ، اولاد، زوجین، استاد شاگرد، مقرر اور خطیب، بیمار اور تیماردار اور تاجر و گاہک، حتیٰ کہ جانوروں تک کے حقوق بیان کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی اہل فرض کے فرائض بھی۔ ریاست اور قیادت اور دولت کے حقوق و فرائض بیان کر کے مرتب نے اس کتاب میں اہم اوراق کا اضافہ کیا ہے۔

خدا حاضر ناظر ہے یا رسولِ خدا؟ | مؤلف و ناشر: چوہدری محمد سرفراز خاں۔
پتہ: موضع کالرہ کلاں۔ ضلع گجرات۔ ص ۲۷۔ قیمت: -/۵ روپے

توحید اساسِ دین اور اس الطاعات ہے۔ ہر صاحب ایمان کا فرض ہے کہ وہ توحید کو سمجھے اور اس سے متعلق سوالات کا حل جاننے کے لیے براہِ راست قرآن و حدیث کی طرف توجہ کرے پھر جو رہنمائی وہاں سے ملے اسے اس طرح قبول کرے کہ اس سے ٹکرانے والی ہر دعوت اور ہر دلیل کو رد کر دے۔ مگر بدقسمتی سے توحید اور اس سے متعلقہ مسائل فرقہ وارانہ بحثوں کے خراد پر چڑھ کر ایسی الجھی شکلیں اختیار کر گئے ہیں اور ہر شکلِ خاص کے علمبردار ایسے علما اور صوفیا، مناظرہ پسند اور عوام کے جذبات سے کھیلنے والے واعظ ہیں اور پھر ان کے ساتھ ایسے پکے بنے ہوئے جتھے ہیں کہ اختلاف کی بات ہوتی نہیں کہ علم و فکر اور دلیل و برہان کے دفتر بند اور فتووں اور الزامات کی توپوں کے دہانے کھل جاتے ہیں۔

بیچارے چوہدری محمد سرفراز خاں وقتاً فوقتاً ایسے مسائل پر پمفلٹ تیار کرتے رہتے ہیں اور ان میں قرآن و حدیث کی بنیادی تعلیمات کے ساتھ عامۃ المسلمین کے معتمد ائمہ سلف اور علمائے حاضرہ کے اقتباسات بھی درج کرتے ہیں۔

عنوانِ بالا کو بھی جتھا بند واعظوں اور مناظروں نے بڑے جھمیلے کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ چوہدری صاحب نے اس مسئلے پر قرآن اور حدیث سے رہنمائی فراہم کی ہے، نیز علمائے حق کی آرا بھی جمع کی ہیں۔ ماننا نہ ماننا الگ چیز ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ ایسی دردمندانہ تحریروں کو غور سے پڑھیں تو سہی۔

فقہ الزکوٰۃ حصہ دوم مولف: ڈاکٹر یوسف القرضاوی۔ عربی سے ترجمہ باہتمام ادارہ معارف اسلامی، کراچی۔ ناشر: البدر پبلی کیشنز ۔۔۔ ۲۳ راحت مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۲

اس کتاب کی جلد اول کا تعارف ہم ترجمان القرآن کے کسی گزشتہ شمارے میں کرا چکے ہیں۔ اس مفید علمی و تحقیقی کتاب کی اب دوسری جلد بھی آگئی ہے۔ اب تیسرے حصے کا ہم انتظار کریں گے۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰
دسمبر ۱۹۸۲ء

تحریکِ اسلامی کے مراحل

از: سید اسعد گیلانی

- اسلامی تحریکوں کی قوت کا سرچشمہ کیا ہوتا ہے۔
- تحریکوں میں انفرادی اور اجتماعی امراض کون سے پیدا ہو سکتے ہیں
- تحریکی امراض سے بچنے کی تدابیر کیا ہوتی ہیں
- دعوت کا نور فہم کی روشنی اور جذبے کی توانائی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے
- تحریک کا قافلہ سخت جان منزلِ مقصود تک پہنچنے کیلئے کن کن مراحل سے گزرتا ہے۔
- دورِ حاضر میں اسلامی تحریکوں کے لیے کامیابی کا راستہ کون سا ہے
- فکر کی روشنی اور عمل کی بیداری کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔

اسی نوعیت کے تربیتی موضوعات اس کتاب میں زیرِ بحث ہیں

تحریکی کارکنوں کیلئے تربیت اخلاق و کردار کی بہترین گائیڈ بک

ضخامت: ۱۶۰ صفحات، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت -/۱۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

عُلماءِ دین! — عُلماءِ طِبّ — بنئیے!!

اور

ایک باعزت، موثر اور مفید — "ذریعہ معاش" جو
دینی خدمات کو موثر اور ان کے دائرہ کو وسیع کرنے کا ذریعہ
بھی ہے — اس سے بہرہ ور ہو جائیے!

الحمد لِلّٰہ

کہ پاکستان میں دینی مدارس کی اسناد کو طبی تعلیم کے لیے بنیادی صلاحیت تسلیم
کر لیا گیا ہے — اور

جَامعہ طبیہ اِسلامیہ فیصل آباد

نے یہ فیصلہ کیا کہ دینی مدارس کے فاضل اور درجہ موقوف علیہ سے فارغ
ذہین طلبہ — کو ترجیحی بنیاد پر قبول کیا جائے اور ان میں سے مستحق حضرات
کو فیس وغیرہ میں خصوصی رعایت کا مستحق بھی قرار دیا جائے۔ **درخواستیں**
بلا تاخیر مع نقول اسناد اور مدرسہ کے مہتمم صاحب کی جانب سے سیرت و
اخلاق کی توثیق کے ساتھ درج ذیل پتہ پر پہنچ جانا چاہئیں۔

(پہلے درخواست پہلے داخلہ کا اصول بھی ملحوظ رہے گا)

عبدالرحیم اشرف — ۳۷۵ — جناح کالونی فیصل آباد